شعبۂ تعمیر و ترقی
دار العلوم ندوۃ العلماء
لکھنؤ

تعمیرِ حیات لکھنؤ

پندرہ روزہ

چندہ سالانہ
سات روپئے
فی پرچہ ۳۰ پیسے

ایڈیٹر سید محمد الحسنی
معاون سعید الاعظمی ندوی

۹ صفر ۱۳۸۵ھ مطابق ۱۰ جون ۱۹۶۵ء

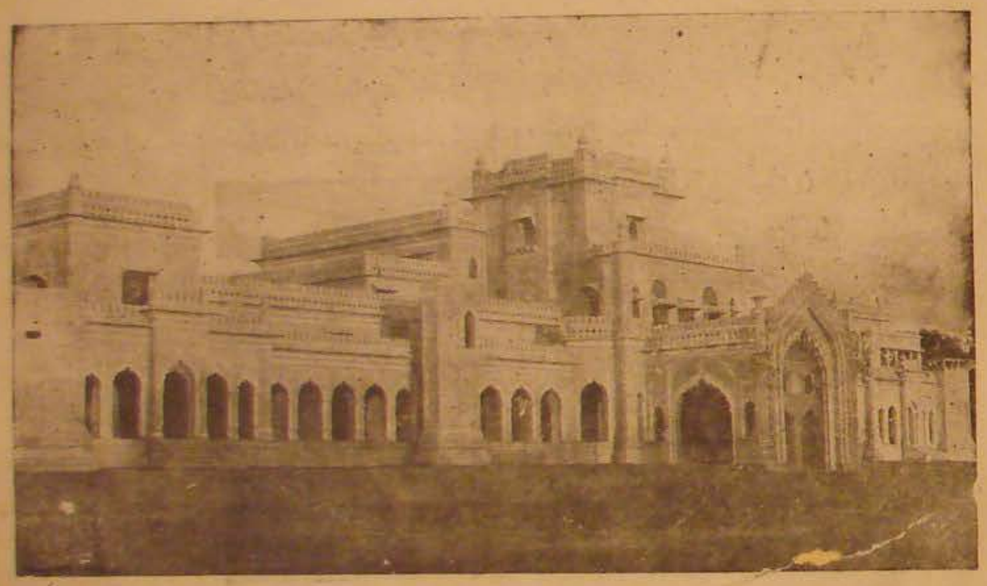

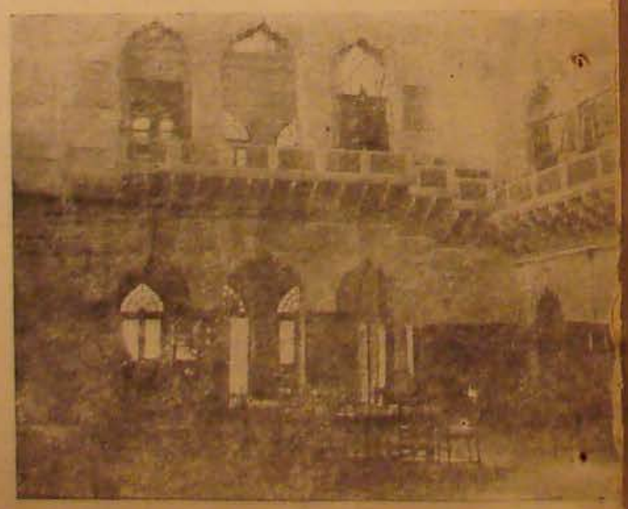

Phone No 22945 Redg No L 1681

TAMEER-E-HAYAT

DARULULOOM NADWATULULAMA LUCKNOW (INDIA)

نورانی تیل
درد، زخم، چوٹ، ورم کی بہترین دوا
انڈین کیمیکل کمپنی، مئوناتھ بھنجن، یوپی

دار العلوم ندوۃ العلماء کا تیار کردہ نصاب

قصص النبیین للاطفال (۳ حصے)

از مولانا ابو الحسن علی ندوی

اس کتاب میں ایک طرف زبان کی تعلیم کے جدید اصول اور ماہرین تعلیم و نفسیات کے تجربات کا لحاظ رکھا گیا ہے کہ یہ کتاب عربی زبان کی تعلیم کا بہترین اور سہل ترین ذریعہ بھی ہے، دوسری طرف انبیاء علیہم السلام کے واقعات اور قصص کو اس پیرایہ اسلوب میں پیش کیا گیا ہے کہ اسلام کے بنیادی اصول خود بخود طلباء کے ذہن نشین ہوتے چلے جاتے ہیں، اس سلسلہ کو ملک عرب میں بڑی قدر کی نگاہوں سے دیکھا گیا ہے!

قیمت حصہ اول ۵۰ پیسے، حصہ دوم ۷۵ پیسے، حصہ سوم ۱/۷۵

القراءۃ الراشدۃ (۳ حصے)

از مولانا ابو الحسن علی ندوی

اس کتاب میں اسلامی تاریخ، نامور اسلامی شخصیتوں، ہندوستان کی اسلامی تاریخ اور اسکی نامور شخصیتوں سے متعلق اسباق، اسلام اور ہندوستان کی تاریخ کا خلاصہ، مشہور دینی درسگاہوں کا تعارف، معلوماتِ عامہ اور ضروری مضامین آگئے ہیں، اسکی کوشش کی گئی ہے کہ کوئی سبق دینی روح سے خالی نہ ہو اور وہ کسی اچھے نتیجہ یا حقیقت کی طرف رہبری کرتا ہو، مدارس عربیہ کی بڑی تعداد نے اس کو داخل نصاب کیا ہے۔

قیمت حصہ اول ۔ حصہ دوم ۔ حصہ سوم ۔

منثورات

از مولانا محمد رابع ندوی

اس کتاب میں مصنف نے ان پاروں کا انتخاب کیا ہے جو زبان کے محاسن اور کلام کی بلاغت کیساتھ دینی و اخلاقی تربیت کا کام بھی دے سکتے ہیں اور اسلامی جذبات پیدا کرنے میں معاون ثابت ہو سکتے ہیں، سیرت نبوی، تاریخ اسلام اور مستند و صاحب طرز انشاء پردازوں کی نثر کے بہترین نمونے پیش کئے گئے ہیں جو عربی زبان و ادب کی بہترین نمائندگی کرتے ہیں نثر قدیم کے ساتھ نثر جدید اور نظم قدیم بھی شامل ہے، مدارس عربیہ کی بڑی تعداد نے داخل نصاب کیا ہے۔

قیمت ۔

مختارات (۲ حصے)

از مولانا ابو الحسن علی ندوی

یہ کتاب عربی کی متوسط اور اعلیٰ دونوں جماعتوں کے نصاب میں داخل کرنے کے لائق ہے اپنی خصوصیات کے لحاظ سے اس وقت تک ادب عربی کی کوئی کتاب اس کا بدل نہیں بلکہ یہ دوسری کتابوں کا نعم البدل ہے، مدارس عربیہ کی بڑی تعداد کے علاوہ لکھنؤ، علیگڑھ، کلکتہ، پنجاب اور مدراس یونیورسٹیوں اور بہت سے کالجوں میں داخل نصاب ہے، شام کے کالجوں میں بھی داخل نصاب ہے۔

قیمت حصہ اول ۔ حصہ دوم ۔

ESTD. 1903
قدرتی تیل
جوڑوں کے درد، زخم، چوٹ، موچ، کٹنے، جلنے میں مفید ہے
کارخانہ دار الصحت مئوناتھ بھنجن۔ یوپی

Cover Printed at Nadwatul Ulama Press LUCKN

روزہ بندرہ
لکھنؤ
تعمیرِ
حیات
شعبۂ تعمیر و ترقی دارالعلوم ندوۃ العلماء
لکھنؤ
۱۰؍ جون ۱۹۶۵ء
مطابق
۹؍ صفر ۱۳۸۵ھ
سالانہ
۷؍ روپے۔
فی پرچہ
۳۰ پیسے
جلد ۲
نمبر شمارہ ۱۵

خود شناسی اور خدا طلبی

از مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی
ناظم دارالعلوم ندوۃ العلماء
نے
سفر حج سے واپسی کے بعد
طلباء دارالعلوم کے دیئے
ہوئے ایک
عصرانہ میں مندرجہ ذیل
تقریر فرمائی جس کو
عبد العلیم بستوی
متعلم
درجہ ہشتم نے قلمبند کیا
ان کے شکریہ کے ساتھ یہ
تقریر ہدیۂ
ناظرین ہے
!

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اما بعد!

بھائیو اور عزیزو! آپ لوگوں نے جن الفاظ کے ساتھ ہمارا خیر مقدم کیا اس کے ہم بہت شکرگذار ہیں، درحقیقت یہ اتنی بڑی دولت ہے جس پر ایک دوست دوسرے دوست کو اور ایک عزیز دوسرے عزیز کو مبارک باد دے سکتا ہے، آپ کے سامنے ہمارے سفر کا تذکرہ کیا گیا۔ اس موقع پر اگر آپ کے دل میں یہ خیال آیا ہو کہ ہم اپنے سفر کے حالات سنائیں گے تو یہ بالکل حق بجانب اور قدرتی بات ہوگی، جب کوئی شخص کہیں جاتا ہے اور خاص طور سے ایسے مبارک سفر پر تو وہاں سے اپنے بھائیوں عزیزوں کے لئے تبرک اور سوغات لاتا ہے، اور خاص طور پر حج سے آنے والوں کا تو قدیم رواج ہے کہ وہاں سے تبرکات لاتے ہیں مثلاً زمزم کھجور تسبیح یا مصلے وغیرہ، ہم کو افسوس ہے کہ ہم اپنے عزیزوں کو یہ تبرکات نہیں پیش کر سکے اس لئے کہ یہ ہمارا سفر اس نوعیت کا نہیں تھا، اب اگر آپ کو یہ خواہش ہے کہ کوئی سوغات نہ سہی کم از کم وہاں کے حالات واقعات ہی سنائے جائیں تو آپ ایسی بالکل حق بجانب ہونگے۔ لیکن میں اس وقت آپ کے سامنے اپنے یا اپنے ساتھیوں کے حالات سفر نہیں بیان کروں گا اور نہ یہ بتاؤں گا کہ ہم لوگوں نے وہاں کیا کیا؟ اول تو ہم نے کوئی کارنامہ انجام نہیں دیا، وہاں لاکھوں اللہ کے بندے حج کو جاتے ہیں ان میں کیسے کیسے اولیاء اور کیسے کیسے خدارسیدہ بزرگ ہوتے ہیں، ان خدا والوں کے سامنے ہماری کیا حیثیت، لیکن اگر ہم نے وہاں کچھ کیا تو یہ ہمارا فرض تھا، اگر ہم نے وہاں کچھ کہا تو ہم نے اسی دن کے لئے عربی پڑھی تھی اور اسی کے لئے ایک عمر عربی سیکھنے میں صرف کی تھی۔ انسان کی اس سے بڑھکر اور کیا معراج ہوسکتی ہے کہ وہ ۔ ۔ ۔ ۔ عربی سیکھے اور پھر اسی کے ذریعہ دینی علوم و فنون میں مہارت حاصل کرے اور پھر جو دولت ان سے حاصل کی ہو بڑی نیازمندی سے سرجھکا کر ان کو پیش کرے اور یہ دولت نہایت ہی تشکر و امتنان کے ساتھ ان کے قدموں پر ڈالدے اور یہ کہے ہذہ بضاعتکم ردت الیکم "اگر ہم نے کچھ کیا تو یہ ہماری انسانیت کا تقاضہ تھا، ہماری شرافت کا تقاضہ تھا اور اس خدا کی رحمت کا تقاضا تھا جس نے ہم کو اس لائق کیا۔ اگر ہم رونگٹے رونگٹے سے اور عضو عضو سے وہاں خدا کی حمد بیان کریں، اس کے اور اس کے رسول کے احسانات کا اعتراف کریں اور ہر ہر رونگٹے میں سو سو زبانیں ہو جائیں" اور سب بولنا شروع کر دیں اور وہ زبانیں بھی سحبان وائل کی طرح ہوں اور ذرات شکر خداوندی کے ترانے گائیں تب بھی ہم اس بارگاہ کا شکر نہیں ادا کر سکتے لیکن

مجلس تحقیقات و نشریات اسلام کی چند اردو مطبوعات

مقالات سیرت
از:۔ ڈاکٹر محمد آصف قدوائی ایم اے، پی ایچ، ڈی
سیرت محمدی کے موضوع پر دنیا کی مختلف زبانوں میں جو لکھا گیا ہے اسکا شمار مشکل ہے، اردو اس باب میں خاص امتیاز رکھتی ہے جس میں بڑی سے بڑی ضخیم کتابیں لکھی جا چکی ہیں، لیکن ڈاکٹر آصف نے مقالات سیرت کے نام سے یہ کتاب تعلیم یافتہ مسلمانوں اور غیر مسلموں کیلئے سیرت کے مختلف پہلوؤں پر لکھی ہے۔
کتابت و طباعت دیدہ زیب، سائز ۱۸×۲۲، صفحات ۲۸۰، قیمت مجلد مع گرد پوش ۴/۵۰

طوفان سے ساحل تک
از:۔ محمد اسد (سابق لیوپولڈ ویس)
ترجمہ:۔ محمد الحسنی (مدیر البعث الاسلامی)
اس کتاب میں مغربی زندگی کے اس طوفان کی تصویر پیش کی گئی ہے جس سے گزر کر محمد اسد صاحب قلبی و روحانی سکون کے ساحل تک پہونچے اور ایمان سے بہرہ یاب ہوئے، اس میں مغربی تہذیب کی مکمل تصویر بھی ہے اور اسلامی معاشرہ کی خصوصیات پر بہت خوبی کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے مفصل مقدمہ کے ساتھ۔
کتابت، طباعت معیاری، کاغذ اعلیٰ، قیمت:۔ مجلد پانچ روپے

ہندوستانی مسلمان
از:۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی
ہندوستان کی تاریخ میں مسلمانوں کا کردار، ان کے شہرۂ آفاق علمی و تعمیری کارنامے، زندگی و تمدن پر ان کا گہری چھاپ، جنگ آزادی میں قیادت و رہنمائی، اور انکے موجودہ مسائل۔ یہ کتاب درحقیقت سینکڑوں کتابوں کا خلاصہ ہے۔
مجلد مع گرد پوش قیمت ۳/۵۰ عربی ایڈیشن ۳/۵۰ انگریزی ۶/-

مجلس تحقیقات و نشریات اسلام ندوۃ العلماء لکھنؤ

پھر بھی یہ بہت بڑی سعادت ہے اور ایک دینی طالب علم کے لئے اس سے بڑھکر کوئی فخر و مباہات کی بات نہیں ہوسکتی۔

ہم نے عرب میں جو کچھ بھی دیکھا اور سنا ہو اور جو کچھ بھی احساسات ہمارے دل میں پیدا ہوئے ہوں لیکن آپ کے لئے یہی سب سے بڑی سوغات ہے کہ آپ اپنی عربیت کو ترقی دیں اور آپنے جو دولت پائی ہے اور "لاالہ" کے جو دو لفظ سیکھے ہیں یہ لفظ کوئی معمولی لفظ نہیں جس لفظ نے دنیا میں عظیم ترین انقلاب پیدا کیا اور جس سے بڑھکر باوقار اور جس سے زیادہ انقلاب انگیز لفظ دنیا کی کسی زبان اور کسی لغت میں نہیں، آپ اپنے اندر اس کو سمجھنے کی صلاحیت پیدا کریں۔

میرے عزیزو! اگر ان مضمرات پر نظر ڈالی جائے جو تمہارے اندر خوابیدہ ہیں، ان طاقتوں اور عظیم صلاحیتوں کا اندازہ لگایا جائے جو تمہارے اندر ودیعت ہیں اور جن کے تم امین ہو اور اگر کوئی تمہاری ان پوشیدہ صلاحیتوں پر نظر ڈالے تو تمہارے لئے سب سے بڑا سبق یہ ہے کہ تم اپنے کو پہچانو، اس لعل بے بہا کی قدر کرو جو تمہارے سینے میں چمک رہا ہے، تم اپنے کو دیکھو تم میں سے ہر ایک مستقبل میں بڑا عالم، محدث، فقیہ اور مفسر بننے والا ہے، اس امانت کی قدر کرو اور پہچانو جو تمہارے اندر ودیعت کی گئی ہے، ہمیشہ انسان کی سب سے بڑی ناکامی یہی رہی ہے کہ اس نے موجود کو دیکھا غیر موجود کو نہیں دیکھا، یافت کو دیکھا نایافت کو نہیں دیکھا، موجودات کو دیکھا ممکنات کو نہیں دیکھا، انبیاء نے ہمیشہ انسان کو یہی سبق دیا کہ وہ اپنے کو پہچانے، انھوں نے ہمیشہ ممکنات کی طرف ہدایت کی، انھوں نے ہمیشہ اس عالم سے ماوراء کی طرف رہنمائی کی، انبیاء کے علاوہ کسی نے یہ سبق نہیں دیا کہ اس کے اندر کون سی طاقتیں خوابیدہ ہیں وہ کہاں کہاں پہونچ سکتا ہے، وہ کہاں کہاں اپنی کمند ڈال سکتا ہے، وہ کیا کیا آفاق ہیں علم کے آفاق، محبت کے آفاق، تسخیر کے آفاق ہیں جہاں انسان پہونچ سکتا ہے، انسان کی بہت بڑی بدقسمتی رہی ہے کہ ہمیشہ بتانے والوں نے موجودات کا درس دیا اسے یہ بتایا کہ وہ کیا ہے یہ نہیں بتایا کہ کیا ہوسکتا ہے اور کن کن آفاق کی تسخیر کرسکتا ہے یہ ان کی سب سے بڑی خیانت اور کوتاہ نظری تھی بلکہ اس سے بڑھکر ایک مجرمانہ سازش تھی کہ انھوں نے اپنی بے بضاعتی اور کم مائیگی کو چھپانے کے لئے ہمیشہ یہ دکھایا کہ انسان نے کیا کیا پایا اور کہاں کہاں پہونچا اور کبھی یہ نہیں بتایا بلکہ اگر کسی نے بتانے کی کوشش کی تو انھوں نے اس بات کو ٹالنے کی کوشش کی کہ وہ کیا کیا پاسکتا ہے، انھوں نے ہمیشہ یہ چاہا کہ انسان موجودات کی طرف دیکھے اسکے اندر تخیل کا جذبہ نہ پیدا ہونے پائے، انھوں نے ہمیشہ تخیل کا گلا گھونٹنے کی کوشش کی تاکہ ان کی بے بضاعتی کا راز نہ کھلنے پائے۔

میرے عزیزو! تمہاری بدقسمتی ہے کہ تم ہمیشہ یہ دیکھتے ہو کہ لوگ کیا کیا بنگئے اور کہاں کہاں تک پہونچ گئے، تم نے یہ کبھی نہ دیکھا کہ ہم کیا کیا بن سکتے ہیں اور کہاں کہاں تک پہونچ سکتے ہیں اور پھر اس میں تمہاری پرواز بھی کوئی بہت اونچی نہیں، کبھی تو تم اپنی برادری اور حلقہ سے آگے نہیں بڑھ پاتے اور کبھی وطن اور معاشرے سے باہر نہیں جاسکتے، تمہارے سامنے ایسی بہت مثالیں ہیں تم دیکھتے ہو کہ جنھوں نے دین سیکھا اور عربی پڑھی انھوں نے یہ پایا، ان ان بلند مدارج پر پہونچ گئے لیکن تم یہ نہیں دیکھتے کہ تم کہاں تک پہونچ سکتے ہو، جنھوں نے اپنی تخیل اور تمناؤں کو زمانے کی کامیابیوں اور پروازوں کے تابع نہیں کیا وہ کہاں کہاں تک پہونچ گئے، میری سب سے بڑی کوشش یہ ہے کہ تم سمجھو کہ تم کیا بن سکتے ہو، اگر کوئی تم سے یہ کہے یا صرف کہتا ہوا گذر جائے اور اس کی معمولی سی بھنک تمہارے کان میں پڑجائے اور اس پر بھی تم کو شبہ ہو کہ واقعی کسی نے کہا ہے یا نہیں، کہ فلاں جگہ فلاں درخت کے نیچے یا فلاں کمرے میں ایک دفینہ ہے تم اس کو کس کسطرح تلاش کروگے اور کس کس طرح راتوں کو چپکے چپکے کھودو گے کہ کسی کو معلوم نہ ہونے پائے لیکن اگر تم سے کوئی کہتا ہے اور وہ بھی کہنے والا کون خدا کا پیغمبر اور مخبر صادق بلکہ اس سے بھی بڑھکر وہ جس نے خود انسانوں کو پیدا کیا "الا یعلم من خلق" اور وہ کہے جو تمہارے رگ و پے سے واقف ہے کہ تمہارے سینوں میں ایک ایسا دفینہ ہے کہ جیسا کسی نے آج تک دفن نہیں کیا اور نہ نکالا تو پھر تمہارے اندر ایک جذبہ کیوں نہیں اٹھتا اور ایک شرارہ کیوں نہیں بھڑک اٹھتا کہ تم اس کو نکالنے کی کوشش کرو، تمہارے اندر اللہ نے جو صلاحیتیں رکھی ہیں اور جس طرح تم انسانوں اور دنیا کے اندر محبت و معرفت کے اعلےٰ مدارج تک پہونچ سکتے ہو، تم ساری دنیا کو اپنا گرویدہ اور عاشق بنا سکتے ہو اس کا تقاضا ... ہے کہ تم اس دفینہ کو نکالنے کے لئے بیتاب اور بے قرار ہو جاؤ، تمہارے اندر کیسے کیسے علم ہیں کیسے کیسے مبلغ ہیں کیسے کیسے ہادی چھپے ہوئے ہیں، تمہارے اندر کیسی کیسی صلاحیتیں ودیعت کی گئی ہیں، تو تمہارے اندر کیوں نہیں ایسا جذبہ پیدا ہوتا کہ تم اسکو بروئے کار لاؤ، تم جب یہاں آئے تو ایک ان گڑھ پتھر تھے لیکن خدا نے تم پر احسان کیا اور تم عالم ہوگئے لیکن تم کو یہ نہیں معلوم ہے کہ تم کیا ہو؟ تم یہ نہیں سوچتے کہ تم کیا کیا بن سکتے ہو اور اگر تم کو یہ معلوم ہوجائے ـــــ اس میں بھی خدا کی مصلحت ہے کہ معلوم نہیں ہوتا۔ اور تم اس سے واقف ہوجاؤ کہ دنیا کو تمہاری کس قدر ضرورت ہے اور دنیا کس قدر تمہاری منتظر ہے اور تم کیا کارنامے انجام دے سکتے ہو تو سچی بات یہ ہے کہ تم اس کو برداشت بھی نہیں کرسکتے۔

میرے عزیزو! تم ایک مدرسے کے طالب علم ہو تم میں امیر بھی ہوں گے، غریب بھی ہونگے، اور متوسط بھی ہوں گے، تمہاری استعداد بھی متوسط ہے اس حیثیت سے تم کوئی خاص قابل قدر نہیں یہ دنیا یہی سمجھتی ہے کہ تم پڑھ لکھ کر زیادہ سے زیادہ چند آدمیوں کی ہدایت کرسکتے ہو یا اپنے لئے کوئی بہتر راستہ اختیار کرسکتے ہو اور اس سے کمتر یہ ہے کہ اپنا معاشی مسئلہ حل کرسکتے ہو تو یہ تمہاری کل کائنات، لیکن یہ کہ کس طرح ہم پیغمبروں کی نیابت کرسکتے ہیں اور دنیا کے درد کی دوا بن سکتے ہیں یہ کوئی نہیں سوچتا یہ سب اس لئے ہے کہ ہماری نظر اس سے ہٹ گئی کہ اس سے کیا پاسکتے ہیں اب تمہارا نصب العین محض یہ رہ گیا ہے کہ یہاں سے نکل کر کسی کالج میں داخلہ لے لیں گے یا کسی یونیورسٹی کا امتحان دیدیں گے لیکن وہ تریاق جس سے سارے وسائل تمہارے تابع ہوجائیں گے اور یہ ساری یونیورسٹیاں اور ان کے چلانیوالے تمہارے تابع ہوجائیں اس تریاق کی طرف تمہیں کوئی توجہ نہیں، اسلام کی آمد کے بعد سے اور صحابہ کرام کے زمانہ سے لیکر اب تک کوئی ایسا دور نہیں آیا کہ جسمیں ایسے نمونے نہ ہوں جن کے لئے اللہ نے دنیا کو مسخر کردیا اور اگر کوئی ایسا دور ہوسکتا تھا جس سے ناامیدی کی جاسکتی ہے تو وہ یہ دور ہے جہاں صرف مادیت ہی مادیت ہے، وسائل و اسباب ہی اصل سمجھے جاتے ہیں اس زمانے کے بارے میں شبہ کیا جاسکتا تھا کہ کہ ابھی ایسی مثالیں شاید نہ مل سکیں لیکن ہمارے اور آپ کے سامنے ایسے نمونے ہیں جنھوں نے اللہ کی رضا کیلئے دینی تعلیم حاصل کی اور ذرا ہمت کی اور اسکا نتیجہ یہ نکلا کہ زمانہ انکے سامنے جھک گیا۔ (باقی آئندہ)

ایک اہم تاریخی حقیقت

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

دنیا میں کسی بڑی تعمیر و انقلاب کی کوئی جدوجہد اور کسی تخریبی تحریک کا مقابلہ دل و دماغ کی اعلیٰ طاقت و قابلیت کے بغیر نہیں ہوسکا ہے۔ کسی گرم و پرجوش صاحب عزم ویقین کا مقابلہ افسردہ، شکست خوردہ اور مذبذب دل سے اور کسی روشن، بلند و فائق ذکی و صاحب اجتہاد دماغ کا مقابلہ پست و سست اور جامد دماغ سے نہیں ہوسکا ہے۔ تاریخ ان مثالوں سے بھری ہوئی ہے کہ ایک گرم و پرجوش دل نے لاکھوں افسردہ اور مذبذب دلوں پر فتح پائی ہے اور ایک بلند و فائق دماغ نے کروڑوں انسانوں کو اپنا محکوم بنا لیا ہے۔ قوموں، تہذیبوں اور دعوتوں کی معرکہ آرائی میں اور ایک قوم کی دوسری قوم پر ایک تہذیب کی دوسری تہذیب پر فتح حاصل کرنے میں شمشیر و سناں اور دست و بازو سے زیادہ قلب و دماغ کا حصہ رہا ہے۔

یونان و روما نے متمدن دنیا پر اپنی حکومت قائم کی اور ایک وسیع و طاقتور شہنشاہی اور ایک مخصوص تہذیب کی بنیاد رکھی۔ یہ محض اس کے ہتھیاروں کی فوقیت، اس کی جنگی مہارت اور اس کی فوجی طاقت کا نتیجہ نہ تھا، آپ اگر تاریخ کے اس دور میں واپس جائیں گے تو آپ کو صاف نظر آئے گا کہ یونان و روما کو اپنے اپنے وقت میں اپنی معاصر قوموں پر کھلی ہوئی فوقیت حاصل تھی، وہ گرم جوش اور بلند حوصلہ دل اور زندگی کے مسائل و مشکلات کے حل، وسائل کے اور زندگی کی نئی تنظیم پر قدرت رکھنے والا دماغ رکھتے تھے۔ ان کو اپنے عزم و یقین اور اپنی ذہانت اور قوت فکریہ میں اپنی گرد و پیش کی قوموں پر نمایاں امتیاز حاصل تھا۔ ان کے غیر ملکی معاصرین کے حالات اور زندگی پر نظر ڈالیں گے تو آپ کو ہر طرف بجھا ہوا دل تھکا ہوا دماغ رکتی ہوئی زبان اور ٹوٹا ہوا قلم نظر آئے گا۔ ذہنی، علمی ادبی، دینی، عسکری شعبے سب بے روح نظر آئیں گے ذہن سے بلند پروازی، علم سے گہرائی، ادب سے دل آویزی شاعری سے جگر سوزی، مذہب سے روحانیت و عملیت زندگی سے عزم اور ولولہ رخصت ہوچکا ہے۔ قومی زندگی کا ہر شعبہ اور علم و فن کی ہر شاخ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اپنی عمر پوری کرچکی ہے اور اس میں نمو و ارتقا کی صلاحیت باقی نہیں رہی۔ ایسی کہن سال رو بزوال قوموں کے مقابلے جب جیتے جاگتے یونان یا روما سے ہوا تو ان کو اپنے جواں سال حریف سے مقابلہ میں شکست کا اعتراف کرنا پڑا اور اس کے لئے راستہ چھوڑنا پڑا۔

بعثت نبوی کے وقت روم و ایران کی حقیقی زندگی ختم ہوچکی تھی ان کے قلب و دماغ میں نئے اور گرم خون کی آمد بند ہوچکی تھی۔ تہذیب و تمدن اور علم و فن میں بوسیدگی آگئی تھی۔ ادبیات، عقلیات اور الٰہیات سب میں عام دماغی پستی اور فکر و خیال کی سستی کے آثار نظر آتے ہیں، جس کا اندازہ آج بھی چھٹی ساتویں صدی عیسوی کے ادبی نمونوں، منطق و فلسفہ اور ہیئت کے ذخیرہ اور اسرائیلیات کے اس ذخیرے سے کیا جاسکتا ہے جو انھوں نے اپنے ترکہ میں چھوڑا ہے۔ اس کے مقابلہ میں نبوت محمدی اور وحی الٰہی نے عربوں کو نئی ایمانی، فکری اور اخلاقی زندگی عطا فرمائی تھی جس کا روم و ایران میں نام و نشان بھی نہ تھا، اس ایمان و علم نے عربوں میں ایسا عزم و یقین، ایسی قلبی قوت اور ایسی دماغی بلندی پیدا کردی تھی کہ رومی و ایرانی باوجود اپنے ترقی یافتہ ہزار ہزار سالہ تمدن، اپنی شائستگی اور علوم و فنون کے ان کے مقابلے میں دماغی حیثیت سے پست، کند ذہن اور نااہل معلوم ہوتے ہیں، ہر شاہی دربار ہر عام مجلس میں ہر ذہنی معرکہ میں مسلمانوں کی ذہانت، ایرانی اور رومی دماغ کو شکست دیتی نظر آتی ہے، مسلمان اپنی معاملہ فہمی، سلامت فکر حقیقت رسی میں اپنے حریفوں سے بہت فائق نظر آتے ہیں۔ ان کے پاس علم الٰہی اور وحی آسمانی کا وہ محفوظ ذخیرہ تھا جس نے ان کو تفکر و تدبر کی دعوت دی تھی اور عادت ڈالی تھی۔ اس معجز کتاب اور اس کے بلند مضامین نے دفعتہً ان کی عقلی سطح کو زمین سے آسمان تک پہونچا دیا۔ طریقہ فکر کو بدلا، زبان و ادب کا معیار اونچا کردیا۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی صحبت و تربیت میں انھوں نے ایسا علم حاصل کیا جس میں گہرائی اور پختگی تھی اور بے تکلفی و سادگی، اور جس نے ان میں حقیقت پسندی اور حق گوئی پیدا کردی۔ اس کے مقابلہ میں رومیوں اور ایرانیوں کے پاس نہ وحی کا کوئی محفوظ سرمایہ تھا نہ انسانی عقل و دماغ کا کوئی زندہ و توانا ذخیرہ علم و ادب اور فلسفہ و حکمت کا کرم خوردہ دفتر تھا جو پچھلے دور انحطاط کی یادگار تھا اور جس میں تجربہ سے زیادہ قیاس اور حقیقت سے زیادہ مفروضات و تخیلات سے کام لیا گیا تھا، یہ بوسیدہ عمارت زندگی کے ابلتے ہوئے چشمے اور بہتے ہوئے دھارے میں کیا ٹھہر سکتی تھی، اسلام کی ایک موج اس کو بہا کرلے گئی۔

کہا جاتا ہے کہ عرب جس ملک میں گئے اور انھوں نے کچھ مدت وہاں قیام کیا انھوں نے اس ملک کی تہذیب معاشرت اور زبان تک بدل دی اور اس ملک نے بغیر کسی جبر و اکراہ کے مسلمانوں کی تہذیب معاشرت اور زبان اختیار کرلی، عراق و شام اور مصر اور شمالی افریقہ اپنی تہذیب معاشرت اور زبان رکھتے تھے، لیکن اسلامی فتوحات کے بعد عربوں کے اثر سے انھوں نے اپنی تہذیب معاشرت اور زبان بدل دی اور آج سیکڑوں برس گزرجانے کے بعد بھی وہاں کی تہذیب و معاشرت اور زبان عربی ہے یہ محض کوئی اتفاقی واقعہ نہیں اور نہ یہ صرف عربوں کے حسن اخلاق، فراخ دلی اور رواداری اور جذبۂ مساوات کا نتیجہ ہے، اس میں بہت کچھ دخل اس ذہنی برتری و دماغی تفوق اور قلبی صلاحیتوں کو ہے جو فاتح عربوں اور ان کے دین و تہذیب کو حاصل تھیں۔ ایک فرسودہ تہذیب ایک پست دماغ، ایک بوسیدہ نظام زندگی، ایک بے روح ادب اور ایک انحطاط پذیر زبان اپنے سے بلند، زندہ و توانا حریف کے مقابلہ میں زیادہ دن نہیں ٹھہر سکتی۔ خصوصاً جبکہ اس کے پاس کوئی دینی دعوت اور انسانیت کے لئے کوئی تازہ پیغام بھی نہ ہو، رومیوں اور ایرانیوں کو زندگی کے ہر موڑ اور علم و تہذیب زبان و ادب کی نمائندگی کے ہر موقع پر اپنی پستی اور کمتری اور عربوں کے تفوق اور برتری کا احساس ہوتا۔ اس احساس کا وہ زیادہ دن تک مقابلہ نہیں کرسکتے تھے اور محض قومی عصبیت، مذہبی تنفر اور نسلی تکبر کی بنا پر اس سے انکار اور گریز نہیں کرسکتے تھے۔ رفتہ رفتہ عربی تہذیب و معاشرت اور زبان و ادب نے ان کی تہذیب و معاشرت اور زبان و ادب کو اور اسلام نے ان کے مذاہب کو متاثر اور مسخر

کا شروع کردیا۔ یہاں تک کہ تھوڑی مدت میں ان ممالک میں عربی تہذیب وادب اور اسلام کا کوئی حریف ورقیب باقی نہیں رہا، اور ان قوموں نے برضا ورغبت اسلامی تہذیب وادب کے اثرات قبول کرلئے۔

اس کے مقابلہ میں جن فاتح قوموں کے پاس کوئی اعلیٰ تہذیب، قیمتی ادبی ذخیرہ، ترقی یافتہ اور وسیع زبان نہیں تھی اور جو دماغی صلاحیتوں میں اپنی مفتوح قوموں سے بھی فائق نہ تھیں، جن کے پاس نہ مذہبی ذخیرہ تھا نہ علمی سرمایہ نہ سیاسی دستور، وہ بجائے اپنی مفتوح قوموں کو متاثر کرنے کے خود ان سے متاثر اور مغلوب ہوگئیں۔ انھوں نے ان کو اپنی فوجی طاقت یا نظم واتحاد سے میدان جنگ یا میدان سیاست میں شکست دے دی، مگر علم وتہذیب کے میدان میں ان سے مات کھائی اور مفتوح قوموں نے اپنے دماغ، تہذیب اور دین وروحانیت سے ان کو اپنا مفتوح بنا لیا، ساتویں صدی میں تاتاریوں نے اپنی فوجی طاقت جفاکشی اور نظم واتحاد سے تمام اسلامی سلطنتوں کو شکست دے دی اور دنیائے اسلام کو ایک سرے سے دوسرے سرے تک اس طرح پامال کردیا کہ ان کے مقابلے میں کوئی سر اٹھانے والا نہ رہا، انھوں نے اسلام کے دارالخلافت بغداد کو اپنی سلطنت کا مرکز بنایا اور ایک وسیع رقبۂ زمین پر اپنی سلطنت قائم کردی، لیکن ان کے پاس نہ کوئی تہذیب تھی نہ کوئی معقول مذہب، نہ کوئی سیاسی دستور، ان کے پاس ان کی قومی زبان تھی، وسط ایشیا کی قدیم ترین تہذیب تھی، اور بت پرستی مذہب، ان میں سے کسی میں مسلمانوں کو متاثر کرنے کی اور ان کی تہذیب ومذہب اور زبان وادب کو شکست دینے کی قابلیت نہ تھی، وہ دماغی حیثیت سے مسلمانوں سے کہیں پست اور تہذیبی وعلمی وسیاسی سرمایہ کے لحاظ سے بالکل بے مایہ اور بے سروسامان تھے، نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی سیاسی برتری اور حاکمانہ حیثیت بھی ان کی زبان وتہذیب کے لئے سفارش نہ کرسکی۔ مسلمانوں نے اپنی دماغی صلاحیتوں اور اپنے دین وآئین سے ان کے خواص کو اتنا متاثر وگرویدہ کرلیا کہ رفتہ رفتہ پوری تاتاری قوم نے اسلام اور اس کی تہذیب ومعاشرت اور ادب وزبان کو اختیار کرلیا۔ اور اس میں بڑے بڑے عالم وفقیہ اور عربی کے مصنف پیدا ہوئے۔

ہندوستان میں جب مسلمان آئے تو اس ملک کی تہذیب وادب اور اس کا قدیم مذہب بہت کچھ اپنی زندگی وتوانائی کھو چکا تھا۔ یہاں کے علم وادب میں تولید وانتاج کی قوت نہیں رہی تھی، سارا ملک مدت دراز سے علمی وادبی اور فکری وذہنی انحطاط کا شکار ہو رہا تھا۔ پورے ملک میں نہ کوئی اعلیٰ درجہ کا شاعر تھا نہ ادیب نہ مصنف نہ عالم نہ کوئی ایسا صاحب دماغ جو سارے ملک اور قوم کو اپنی ذہانت وتفکیر سے متاثر کرسکے، ادب اپنی روح کو کھو چکا تھا، گیتا اور رامائن کے بعد کوئی ایسا طاقتور اور زندہ جاوید ادبی نمونہ نہیں پیدا ہوا تھا جو اس ملک کے ادبی شعور کی زندگی کو قائم رکھتا، زبان ہزاروں برس سے ہمالیہ کی دیواروں اور سمندر کے ساحلوں کے درمیان محصور رہ کر بہت محدود رہ گئی تھی، ایشیا کی قوموں اور ان کی تہذیبوں اور زبانوں نے اس عرصہ میں جو ترقی کی تھی اور فکر وادا کے جو نئے اسالیب پیدا کئے تھے اور زندگی اور ذہن کی جولانی کے لئے جو نئے میدان دریافت کئے تھے، ہندوستانیوں کو ان کا کوئی علم نہ تھا، ذہنی اعصاب وقویٰ عرصہ سے معطل رہنے کی وجہ سے سست اور افسردہ ہو چکے تھے اس کے مقابلہ میں وسط ایشیا سے جو مسلمان قومیں اس ملک میں داخل ہو رہی تھیں ان کی رگوں میں زندگی کا نیا اور گرم خون دوڑ رہا تھا، وہ نئی ذہانت نئے علمی سرمایہ اور ایک عالمگیر اور وسیع مذہب کے حامل تھے، ان کی ذہانت اور ان کے علم وادب کا شباب تھا۔ ان کی دماغی صلاحیتوں اور ان کی مردم خیز نسلوں کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ (آٹھویں صدی ہجری) میں جبکہ مسلمانوں کی باقاعدہ حکومت قائم کئے ڈیڑھ سو برس ہوئے تھے، علاء الدین خلجی جیسا متقن اور سیاسی، فیروز تغلق جیسا منتظم، شرف الدین احمد بن یحییٰ بہاری جیسا حکیم اور حقیقت شناس، ضیاء الدین برنی جیسا مورخ، امیر خسرو جیسا ذہین وطباع پیدا ہوا۔ درحقیقت اس ملک کو محمود غزنوی اور شہاب الدین غوری کی تلوار ہی نے فتح نہیں کیا بلکہ خواجہ معین الدین چشتی، شیخ علی بن الشہاب ہمدانی اور خواجہ نظام الدین اولیاء کے روحانی تفوق اور قوت قلب کا بھی اس میں بڑا ہاتھ تھا، صرف فوجی افسر اور منتظم کسی ملک کو اس وقت تک قابو میں نہیں رکھ سکتے جب تک کہ ان کی پشت پر اعلیٰ دماغی قابلیت اور حاکم قوم کی ذہنی واخلاقی برتری کا اثر نہ ہو، فاتح مسلمان قوموں نے اس ملک کے رہنے والوں پر اپنی ذہنی، اخلاقی، روحانی اور علمی برتری کا نقش قائم کردیا تھا۔ اور اس ملک پر حکومت کرنے اور اس کو اپنی نگرانی میں رکھنے کا استحقاق ثابت کردیا تھا، اعتبار واثر کا یہی ذخیرہ تھا۔ جو صدیوں کام آ رہا، مسلمان اس میں وقتاً فوقتاً اضافہ بھی کرتے رہے اور ہر دور میں اپنی ذہنی، علمی اور اخلاقی وروحانی برتری کا تازہ ثبوت دیتے رہے، کسی قوم کا ماضی ذہنی وعلمی اعتبار سے خواہ کتنا شاندار ہو جب تک وہ اپنی دماغی شادابی وزرخیزی اور اپنی دماغی صلاحیتوں کا ہر دور میں ثبوت نہ دے اس کی برتری تسلیم نہیں کی جاسکتی۔ مسلمانوں نے اس ملک میں پچھلی صدیوں میں ایسے باکمال اور اہل فضل پیدا کئے جن کی نظیر دوسری قوموں میں ملنی مشکل ہے۔ روحانیت اور قلبی کمالات میں دیکھئے تو شیخ نصیر الدین چراغ دہلوی (م ۷۵۷) شیخ نور الحق پنڈوی (م ۸۱۸) سید محمد گیسو دراز (م ۸۲۵) شیخ احمد عبدالحق ردولوی (م ۸۳۶) علی عاشقان سرائے میری (م ۹۵۵) شیخ کمال الدین کیتھلی (م ۹۷۱) خواجہ باقی باللہ (م ۱۰۱۴) سید آدم بنوری (م ۱۰۵۳) خواجہ محمد معصوم (م ۱۰۷۹) خواجہ محمد زبیر (م ۱۱۵۱) مرزا مظہر جان جاناں (م ۱۱۹۵) وغیرہ جیسے افراد نظر آتے ہیں جن کا اپنے کمال میں ثانی نظر نہیں آتا، معارف وحقائق اور عزم ویقین میں دیکھئے تو شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی (م ۱۰۳۴) شاہ ولی اللہ دہلوی (م ۱۱۷۶) سید احمد شہید (م ۱۲۴۶) اور شاہ اسمٰعیل شہید (م ۱۲۴۶) علم وتجود مطالعہ میں شیخ علی متقی (م ۹۷۵) شیخ محمد طاہر پٹنی (م ۹۸۶) شیخ عبدالحق دہلوی (م ۱۰۵۲) سید مرتضیٰ بلگرامی (م ۱۲۰۵) قاضی ثناء اللہ پانی پتی (م ۱۲۲۵) اور شاہ عبدالعزیز دہلوی (م ۱۲۳۹) علوم عقلیہ اور فلسفہ وحکمت میں ملا محمود جونپوری (م ۱۰۶۲) قاضی محب اللہ بہاری (م ۱۱۱۹) اور شاہ رفیع الدین دہلوی (م ۱۲۳۳) ریاضی اور فن ہیئت میں میرک عبدالباقی ٹھٹھوی (م ۹۸۳) مولانا فرید الدین دہلوی (م ۱۰۳۹) علامہ تفضل حسین لکھنوی (م ۱۲۱۵) قاضی القضاۃ نجم الدین کاکوروی (م ۱۲۲۹) وغیرہ۔ فن تعلیم اور کثرت درس وتدریس میں مولانا عبداللہ طلمبی (م ۹۲۲) علامہ وجیہ الدین گجراتی (م ۹۹۸) مفتی عبدالسلام لاہوری (م ۱۰۳۷) مفتی عبدالسلام دیوی، علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی (م ۱۰۶۷) مولانا احمد (ملا جیون) امیٹھوی (م ۱۱۳۰) اور ملا نظام الدین سہالوی (م ۱۱۶۱) ادبیات واصناف شاعری میں ابوالفیض فیضی (م ۱۰۰۴) غنی کشمیری (م ۱۰۷۹) ناصر علی سرہندی (م ۱۱۰۸) مرزا عبدالقادر بیدل (م ۱۱۳۳) سید عبدالجلیل بلگرامی، (م ۱۱۳۸) مولانا غلام علی آزاد بلگرامی (م ۱۲۰۰) انھوں نے جب بھاشا اور ہندی شاعری کی طرف توجہ کی تو ملک محمد جائسی (م ۹۴۴) رزق اللہ دہلوی (م ۹۸۹) رحمۃ اللہ بلگرامی (م ۱۱۱۸) مولانا برکت اللہ مارہروی (م ۱۱۴۲) شاہ قاسم دریابادی (م ۱۱۴۹) مولانا غلام نبی بلگرامی (م ۱۱۶۳) اور مولانا محمد ظاہر بریلوی (م ۱۲۰۸) جیسے شاعر پیدا کئے جن کی نظیر خود اہل زبان میں آسانی سے ملنی مشکل ہے۔

انسانی تاریخ کی

ایک مثالی حکومت

(از مولانا سید مناظر احسن گیلانی سابق صدر شعبۂ دینیات جامعہ عثمانیہ)

کوئی تراشا ہوا خیالی افسانہ نہیں بلکہ معتبر راویوں کی مسلسل سند کے ساتھ مشاہدات اور تجربات کا جو مجموعہ ابن سعد کے طبقات میں پایا جاتا ہے، اسی کو ایک خاص ترتیب کے ساتھ آپ کے سامنے پیش کر رہا ہوں ہر ہر واقعہ کیلئے حوالہ کی ضرورت اس لئے نہیں سمجھی گئی کہ یہاں جو کچھ بھی درج کیا جا رہا ہے صرف ایک ہی کتاب سے ماخوذ ہے۔

دنیا کے تین مشہور دل کشا اور دل آویز سیر گاہوں میں وہ خوش شہر اور اس کا مینو سواد علاقہ سمجھا جاتا ہے[۱]، جہاں کے حکمران کی تاریخی [illegible] دہرانا چاہتے ہیں۔

جانشین کے انتخاب کے کاغذات مرتب ہو چکے ہیں، جس حکمراں کی جانشینی کا مسئلہ طے کیا گیا ہے، وہ اپنی آخری سانسیں پوری کر رہا ہے، انتخاب کے وثائق ملک کے جس باوقار صاحب علم بزرگ کے سپرد کئے گئے ہیں، ان کو حکم ہے کہ جب تک موت اپنے فیصلہ کو قطعی شکل میں صادر نہ کرے، اس وقت تک انتخاب کس کا ہوا اس کو صیغۂ راز میں رکھا جائے، جس کا انتخاب کیا گیا ہے، اس کو خود اس کی خبر نہیں ہے، مسئلہ معمولی نہیں ہے، ایک بڑی حکومت کی حکمرانی اور فرمانروائی کا مسئلہ جس کی قلمرو کے حدود میں ایشیا اور افریقہ ان دونوں براعظموں کے تقریباً اکثر اور بڑے آباد علاقے شریک ہو چکے ہیں، اور جو شریک نہیں ہوئے، حالات ایسے سازگار ہیں کہ ان کی شرکت کی توقع بھی بعید از قیاس نہیں ہے، بلکہ یہ سمجھا جائے کہ جس زمانہ کا یہ واقعہ ہے اس زمانہ میں کرۂ زمین کی سب سے بڑی قاہر اور ہر لحاظ سے ممتاز ترین حکومت بھی تھی تو یہ بیجا نہیں بلکہ واقعہ کا اعتراف واظہار ہوگا۔

بہرحال راز کے وثائق کے امین سے وہی جن کا اس حکومت کی فرمانروائی کے لئے انتخاب ہو چکا ہو دیکھا گیا کہ وہی ان سے کہہ رہے ہیں۔

"اگرچہ کچھ بھی میری محبت اور قدر وقیمت آپ کے دل میں ہے تو خدارا مجھے آگاہ کیجئے کہ کہیں سرِ فال میرا نام تو نہیں ڈالا گیا ہے، مجھے اس کا اندیشہ ہے کہ کہیں یہی نہ ہوا ہو۔

ابھی اس کا وقت باقی ہے کہ اس فیصلہ کو میں بدلوا سکتا ہوں، بات اگر ہاتھ سے نکل گئی، تو جو کچھ میں اس وقت کرسکتا ہوں، آئندہ وہ میرے بس کی بات نہ رہے گی۔"

جو اس حکومت کی صدارت نہیں بلکہ بادشاہی کیلئے چُنا جا چکا ہے، مگر اپنے انتخاب کے اس واقعے سے بے خبر ہے، گڑگڑانے لگا، خود ان ہی کا بیان ہے جن سے وہ کہہ رہا تھا کہ

"دیکھئے اس بڑے کام کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے قابل اپنے آپ کو نہیں پاتا۔"

بار بار اسی فقرے کو وہ دہراتے جاتے تھے "امانت میں خیانت ہوگی اگر وقت سے پہلے تم کو میں آگاہ کردوں" یہی جواب ان کو ملتا رہا۔ جب تقاضا حد سے زیادہ گزر گیا، تب میں نے یہ جان کر کہا کہ یہی ایک ذریعہ ان کے خاموش کرنے کا ہو سکتا تھا۔

بولے

"خوب میں سمجھتا ہوں اپنے دل کی آرزو کو اس طریقہ سے تم میرے آگے پیش کر رہے ہو، چاہتے ہو کہ تمہارے لئے میں کوشش کروں، تم پر حکمرانی کے شوق کی حرص سوار ہے۔"

"یہ ایسا سخت اور کارگر حملہ تھا کہ منہ لٹکا کر بیچارے چلے گئے"، قدرت نے فیصلہ کردیا اور باب بست وکشاد [illegible] ہوتے، نفاذ کھولا گیا، اور بادشاہی کے لئے جو چُنا گیا تھا، اس کے نام کا اعلان کردیا گیا جن کے سپرد یہ امانت ہوئی تھی ان ہی کا بیان ہے،

"میں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے اس شخص کے بازو کو پکڑا، اور اٹھا کر بزور اس منبر پر لے جا کر بٹھا دیا، جس پر انتخاب کے بعد حکمران کو کھڑے ہو کر خطبہ دینا پڑتا ہے۔"

وہی کہتے ہیں میں ان کو منبر کی طرف لئے چلا جا رہا تھا، اور ان کی زبان پر بے ساختہ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ جاری تھا اور یہ کہہ رہے تھے کہ میں جس چیز کو نہیں چاہتا تھا وہی زبردستی میرے سامنے آئی، بادشاہی کا اعلان ہوگیا، تخت نشینی کیلئے یا منبر نشینی کی تقریب ختم ہوگئی تھی۔

گھوڑے ہیں، تختے ہیں، طرح طرح کی سواریاں قطار در قطار سامنے ہیں، ہر گھوڑے اور تختے کی لگام ایک سائیس کے ہاتھ میں ہے۔

ان ہی سواریوں میں مرحوم سابق حکمران کا شاہی گھوڑا بھی اپنی کامل زیب وآرائش کے ساتھ سامنے لاکر کھڑا کیا گیا اور [illegible] سوار ہو جائیے انھوں نے گردن جھکائی اور بجائے شہسوار اشہب رنگ کا تختہ جس پر ہمیشہ سوار ہوتے تھے، حکم دیا کہ سب کو لیجاؤ اور اسی تختہ کو میرے سامنے لاؤ

۱؎ اسلامی تاریخوں میں غوطہ دمشق وادی سمرقند، نہر ابلہ یعنی دریائے دجلہ کے متعلق یہی یاد کرایا گیا ہے۔

۲؎ معارف حضرت عمر بن عبدالعزیز نے صرف انتخاب سے پہلے اپنی نامزدگی کی مخالفت پر بس نہیں کیا بلکہ چونکہ آپ کا انتخاب شوریٰ سے نہیں ہوا تھا اسلئے انتخاب وبیعت کے بعد مجمع عام میں دستبرداری ظاہر کی، اور مسلمانوں کو مخاطب کرکے تقریر فرمائی، لوگو! میری خواہش اور عام مسلمانوں کے مشورہ کے بغیر مجھ کو خلافت کی ذمہ داری میں مبتلا کیا گیا ہے، اس لئے میری بیعت کا جو طوق تمہاری گردن میں ہے۔ میں خود اسے اتارے دیتا ہوں تم جسے چاہو اپنا خلیفہ منتخب کرلو۔ یہ تقریر سن کر مجمع نے شور بلند کیا کہ ہم سب نے آپ کو خلیفہ بنایا ہے، اور آپ کی خلافت سے راضی ہیں جب آپ کو اس کا یقین ہوگیا کہ کسی شخص کو آپ کی خلافت سے اختلاف نہیں ہے اس وقت اس منصب کو قبول فرمایا۔

(سیرۃ عمر بن عبدالعزیز ابن جوزی ص ۱۰۰)

چنانچہ لایا گیا اور آپ سوار ہو کر چل پڑے، جلوس کی شاہانہ سواریاں واپس ہو گئیں، جا رہے تھے، سامنے دارالخلافت کا قصر رفیع تھا، مگر اپنے خیمہ کا سوار آگے بڑھا جا رہا تھا، عرض کیا گیا کہ بادشاہ کا محل یہ ہے، فرمایا اس میں مرحوم کے بچے اور اہل وعیال ابھی ہیں، میرے لئے تو میرا فسطاط (خیمہ) ہی کافی ہے، یہ فرماتے ہوئے حکم دیا گیا کہ مرحوم کے لوگوں کے لئے پہلے مکان کا نظم کر دیا جائے، تب حکومت کے کاموں کی نگرانی کیلئے میں حکومت کے اس مکان میں آؤں گا، یہ بھی کہا گیا۔

شاہی توشک خانہ سے غالیچوں، قالینوں، گدوں، سطرنجیوں، مسندوں کا ایک انبار اسی پرانے خیمہ یا خیمہ میں بھیجدیا گیا، یہ کیا ہے شاہی فراش خانہ کا سامان ہے، جواب دیا گیا، سب کو واپس لیجاؤ، صرف آرمینیہ کا بنا ہوا ایک نمدہ اس سے نکال لیا گیا، زمین پر خود ہی اسے بچھا کر بیٹھ گئے۔ حکومت کے کام کو اسی پہ بیٹھ کر اگر انجام نہ دیتا، تو میں تجھ پر ہرگز نہ بیٹھتا، یہ فقرہ آرمینیہ کے اسی نمدے کو خطاب کر کے کہا گیا۔

فرمان پر فرمان حکم پہ حکم جاری ہونے لگا، غیر قانونی ذریعہ سے جس کے پاس جو چیزیں بھی پہنچی ہیں، ایک ایک کر کے واپس کر دیجائیں خواہ وہ کوئی ہو اور خود فیصلہ کیا کہ سب سے پہلے اس کام کو چاہیئے کہ میں خود اپنی ذات سے شروع کروں۔"

کوڑی کوڑی کا حساب کیا گیا، قانون نے جسکی واپسی کا حکم دیا، وہ واپس کر دی گئیں، جن میں بعض غیر معمولی پتھر کے نگینے بھی تھے،

ہر صوبہ اور ہر صوبہ کے ہر ضلع میں رد مظالم کا نظم کیا گیا، یعنی غیر قانونی ذرائع سے جن کے پاس جو کچھ ہو اس کو حقداروں تک پہونچا یا جائے۔ اس کا خاص محکمہ کھولا گیا، صوبہ کے مقامی خزانے کی رقم اگر کافی نہیں ہوتی تھی، تو مرکزی خزانہ سے روپیہ بھیجا جاتا تھا اور یوں حقداروں تک ان کے حقوق پہنچا دیئے گئے۔

طے کیا گیا کہ حکومت کی چیزوں کے استعمال کا حق صرف اسی وقت تک ہے جب تک کہ حکومت کا کام انجام دیا جائے اس قسم کے عملی نمونوں کو پیش کر کے حکام اور عہدہ داروں پر اپنا منشا واضح کیا جاتا تھا، مثلاً حکومت کا کام رات کو جب کرتے تو حکومت کی شمع استعمال ہوتی، مگر اس وقت کسی ذاتی ضرورت کے لئے کچھ لکھتے تو وہ بجھا دیجاتی، اور ذاتی مملوکہ شمعدان کی روشنی سامنے رکھدی جاتی۔

شاہی خزانے سے مشک کا ذخیرہ برآمد ہوا، دیکھا گیا کہ ناک کو انگلیوں سے بند کئے ہوئے ہیں، کہنے والے نے کہا اگر خوشبو ناک میں آگئی، تو یہ مشک میں تصرف نہ ہوا، فرمایا بجز خوشبو کے مشک میں اور ہوتا ہی کیا ہے،

عوام کے لئے حکومت کی طرف سے سردیوں کے موسم میں گرم پانی کا انتظام غسل اور وضو کے لئے کیا جاتا تھا، ابتداء میں دو ایک مہینے تک وہی پانی آپکے لئے استعمال میں بھی آیا، بعد کو معلوم ہوا کہ حکومت کے خرچ سے پانی گرم کیا جاتا ہے تو حساب کر کے اتنی لکڑیاں حکومت کے ذخیرے میں جمع کرا دی گئیں۔

مستمندوں، مسکینوں، مسافروں کے لئے شاہی مہمان خانے سے کھانا کھلانیکا نظم کیا گیا تھا۔ اسی باورچی خانہ سے دہی کا ایک پیالہ آپ کی بیوی صاحبہ کے لئے لونڈی مانگ کر لے جا رہی تھی، پوچھا کیا ہے؟ لونڈی نے عرض کیا آپ جانتے ہیں کہ بیوی صاحبہ حاملہ ہیں دہی کی خواہش ان کو ہوئی، وقت پر کہیں نہیں ملا۔ لونڈی نے یہ بھی کہا، مشہور ہے کہ حاملہ عورت کی خواہش اگر نہ پوری کی جائے تو کہا جاتا ہے کہ بچہ ساقط ہو جاتا ہے، اسی لئے مہمان خانے سے دہی مانگ کرے جا رہی ہوں، لونڈی کے ہاتھ سے پیالہ لے لیا گیا اور گھر پہنچے تو کڑکتے ہوئے کہہ رہے تھے۔ "اگر غرباء اور فقراء ہی کے کھانے سے بچہ پیٹ میں ٹھہر سکتا ہے تو خدا تیرے پیٹ کے بچہ کو گرا دے۔"

اور دہی کا پیالہ واپس کر دیا گیا۔

اس معاملہ میں حکام کا شعور اس حد تک بیدار ہو چکا تھا کہ ایک بڑے محکمہ کے ذمہ دار افسر کا بیان ہے کہ حسب دستور میں کاغذات پیش کر رہا تھا۔ اب ایک بالشت تھا یا چار انگل کے برابر سادہ کاغذ تھا، میں نے دیکھا کہ اس سادہ کاغذ کو اپنی ذاتی ضرورت میں انھوں نے استعمال کیا، چونکہ یہ پہلا واقعہ تھا جو اس افسر کے سامنے گذرا تھا، دل میں خیال آیا آج غفلت کا، شکار یہ شخص بھی ہوا مگر دوسرے دن وہی کہتے ہیں کہ خلاف دستور کاغذات جو دیکھے ہوتے تھے، ان کے بستے کو واپس منگایا، میں نے بھیج دیا، واپسی کے بعد جب اپنے بستے کو کھولا تو دیکھا کہ سادے کاغذات کا ایک ٹکڑا جو اسی کاغذ کے برابر تھا بستے میں دوسرے کاغذوں کے ساتھ لپٹا ہوا رکھا ہے "غفلت کا شکار ہوا" اپنے اس خیال میں مجھکو ترمیم بھی کرنی پڑی اور حکمران کی نظر ان معاملات میں کتنی کڑی اور سخت ہے، اس کا بھی تجربہ ہوا،

خیر یہ تو ان کے ذاتی قصے ہیں، دیکھنے کی بات حکمرانی کے وہ خاص طریقے ہیں، جو انھوں نے اختیار کئے تھے، سب سے پہلی چیز تو یہی ہے کہ خود اپنے آپ کو انتخاب کیلئے پیش کیا، بلکہ آپ سن چکے ہیں کہ اس سلسلہ میں ان کی کوشش کی نوعیت اس طریقہ کار کے بالکل برعکس تھی، جسے آج انتخابی قصوں میں لوگ اختیار کر رہے ہیں، "در مدح خود قصیدہ گفتن" جسکا دوسرا ترجمہ مینی فسٹو کیا جا سکتا ہے، اور لوہے کا وزن نہیں لیکن چاندی اور سونے کے دباؤ سے رائے عامہ کو دبانے اور ضمیر واحساس کے خلاف اپنے مطابق بنانے میں کرنے والے جو کچھ کر رہے ہیں، سب کے سامنے ہے، آخر کیا فرق ہے چنگیز وتیمور کی آہنی تلوار اور انتخابی ارکان کے نقرئی وطلائی گرزوں میں یقیناً روح کے لحاظ سے دونوں کے جرم کی نوعیت ایک ہی ہے، صرف بیرونی قالب بدلا ہوا ہے،

دوسری بات اس سلسلہ کی وہ ہے کہ عنان حکومت کو ہاتھ میں لینے کے ساتھ ہی انھوں نے ملک کی چند ایسی ممتاز اور نمایاں ہستیوں کا انتخاب کیا جن کی سیرت وکردار کی استواری، علم وفہم کی گہرائی پر اس عہد کی عام مخلوق کامل اعتماد رکھتی تھی، یہ دس آدمیوں کی مجلس شوریٰ تھی، اراکین شوریٰ کو سامنے بٹھا کر حکمران کی طرف سے یہ عہد نامہ پیش ہوا کہ

"میں آپ لوگوں میں سے ہر ایک کی یا جو مجلس شوریٰ میں حاضر رہیں گے ان کی رائے کے بغیر کوئی فیصلہ نہیں کروں گا۔"

اور حکومت کے پورے دور میں اس عہد نامہ کی پابندی کی گئی۔

ملک کافی وسیع تھا، انتظام کے لئے جتنے آدمیوں کی بھی ضرورت ہوتی ہوگی، اس کا خود اندازہ کیا جا سکتا ہے، اسی مجلس شوریٰ کے ایک رکن نے بڑی اچھی بات اس وقت کہی، جب بھروسے کے قابل کارآمد آدمیوں کے مہیا کرنے کے سوال انھوں نے پیش کیا، مجلس شوریٰ کے رکن نے کہا۔

"آپ اس کی زیادہ پروا نہ کریں، آپ کی حیثیت تو گویا بازار کی ہے، ہر بازار میں جس چیز کی طلب ہوتی ہے، رسد بھی اسی طلب کے مطابق ہوتی ہے، آپکے بازار میں جس چیز کی مانگ ہے قدرۃً وہی آپکے ہاں آئے گی۔"

مگر اس بازار کے لوگوں کو جب معقلات میں بھیجے،

تو وہاں کے پبلک عام کے نام حکمران اپنا ایک خریطہ بھی بھیجا تھا، جس میں لکھا ہوتا کہ۔

"میں جنھیں بھیج رہا ہوں یہ تو نہیں کہتا کہ وہ تم میں سب سے زیادہ بہتر ہیں، مگر اتنی بات کہہ سکتا ہوں کہ تم میں جو بڑے لوگ ہیں، ان سے شاید یہ اچھے ہوں۔"

سب سے زیادہ توجہ اپنے ولاۃ اور حکام کو اس مسئلہ کی طرف دلاتے تھے کہ رعایا پر محصولوں کا جو بار ہے حتی الوسع اس بار کو ممکنہ حد تک کم کرنے کی کوشش کیجائے، عموماً محصولوں کی وہ قسم جسے اس زمانہ میں مکس اور ٹیکس ——— کہتے ہیں، ان کا اور ان کی مختلف قسموں کا فرامین میں ذکر کر کے لکھا کرتے۔

"یہ مکس نہیں بلکہ بخس ہے، اور یہی وہ چیز ہے جس کے متعلق قرآن میں ولا تبخسو الناس اشیاءھم ولا تعثو فی الارض مفسدین (اور کم نہ کرو لوگوں کی چیزوں میں، اور بگاڑ پیدا کرنے والے ان مفسدین میں نہ بنو جنھوں نے زمین میں سر اٹھا رکھا ہے)۔"

ایک دفعہ شکایت پیش ہوئی کہ محصولوں کی تخفیف کی وجہ سے آمدنی فلاں علاقہ کی بہت کم ہو گئی ہے فرمان والی کے نام گیا" میں نے ان محصولوں کو نہیں ساقط کیا، بلکہ خدا نے ساقط کیا ہے" دارالسلطنت میں خبر پہونچی کہ ایک علاقہ میں حکام کا دستور ہے، کہ پیداوار کی قیمت بازار کے مطابق نہیں بلکہ منمانے طریقہ سے لگا کر رعایا سے خراج وصول کرتے ہیں، اسی وقت حکومت نے اپنے دو معتبر نمائندے بھیجے حکم دیا گیا کہ جس کسی سے جتنی مقدار بھی زائد وصول کی گئی ہو فوراً واپس کر دیجائے۔

اور گورنر کے لئے حکم تھا ——— ان دونوں کے کام میں تمہاری طرف سے کسی قسم کی رکاوٹ اگر ڈالی گئی تو یاد رکھو کہ تمہیں جو بات ناگوار ہوگی اسے اپنے سامنے پاؤ گے،

گھوڑوں پر ڈاک آتی تھی راستہ میں کسی مقام کی ڈاک کے گھوڑے بیکار ہو گئے، مقامی کسانوں کو بیگار کے طور پر حکام نے پکڑا اور ان ہی پر ڈاک لاد کر دارالسلطنت روانہ کر دی گئی، اطلاع ہوئی، لکھا ہے کہ بیگار لینے والے پر پہلے تو چالیس کوڑے لگائے گئے، اور کہا کہ میری حکومت میں اور بیگار؟

شاہی خزانے کے تین شعبے کر دیئے گئے، ایک شعبہ میں خراج اور مال گذاری کی عام آمدنی جمع ہوتی تھی اور دوسرے میں فوجی فتوحات کی آمدنی کا پانچواں حصہ جسے خمس کہتے تھے، جمع ہوتا تھا، اور تیسرا مستقل شعبہ ملک کے حاجتمندوں، غریبوں، یتیموں، تاوان زدہ افراد، مسافروں وغیرہ کیلئے مختص تھا، صدقات وزکوٰۃ کی آمدنی اس شعبہ میں جمع ہوتی تھی، دیکھا گیا تھا، دیکھنے والوں کا چشم دید بیان ہے، ایسا نظم قائم کر دیا گیا کہ گذشتہ سال جو خود خیرات کا مستحق تھا، اس کے پاس اتنا سرمایہ اکٹھا ہو گیا ہے کہ خود صدقہ ادا کر رہا ہے۔"

تجارت میں زراعت میں یا کسی اور کاروبار میں جو نقصان اٹھاتے تھے، یا مقروض ہو جاتے تھے، بیان کیا گیا ہے کہ ملک کے دور دراز گوشوں سے اس قسم کے تاوان زدہ افراد آتے، ان کے واقعہ کی تحقیق کی جاتی، جب ثابت ہو جاتا کہ واقعی تاوان کے وہ شکار ہوئے ہیں تو صدقات کے شعبہ سے ان کی تلافی کر دی جاتی تھی، لکھا ہے کہ چار چار سو طلائی اشرفیاں بسا اوقات کسی ایک ایک آدمی کو اس سلسلہ میں ملتی تھیں نہ صرف مرکزی خزانہ سے یہ امداد لوگوں کو ملتی تھی بلکہ ہر ہر علاقہ کے مقامی خزانوں میں یہ سلسلہ جاری رہتا تھا، عام فرمان تمام ملک میں گشت کرا دیا گیا تھا کہ جس شخص پر کوئی ایسا بار ہو جس کے ادا کرنے کی قدرت نہیں رکھتا تو خزانے سے رقم اس کی طرف سے ادا کر دیجائے۔"

یہی نہیں بلکہ اسی فرمان میں یہاں تک لکھا پایا جاتا ہے کہ جو شادی کرے، اور مہر ادا کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا، اسکو بھی مہر ادا کرنے کے لئے خزانے سے رقم عطا کیجائے۔

سرکاری خزانے کی ان مدوں سے استفادے کے لئے صرف یہ شرط تھی کہ وہ ملک کا باشندہ اور قانونی رعیت ہو، کسی نسل سے ہو، کسی فرقہ کا ہو کسی قسم کا مذہب رکھتا ہو، ہر ایک کیلئے دروازہ کھلا ہوا تھا، لکھا ہے کہ

"ایک ایک بطریق (عیسائی پادری) کو ہزار ہزار طلائی اشرفیاں دی گئیں"

کم سے کم رعایا سے لیا جائے، اور زیادہ سے زیادہ مقدار میں ان ہی سے لئے ہوئے مال کو انہی تک ایک خاص نظم کے تحت واپس کر دیا جائے یہی ایک حاشیئی اصول" جس پر یہ مثالی حکومت کارفرما نظر آتی ہے، اس سلسلے کے تفصیلات اگر تلاش کئے جائیں، تو ان سے کافی مجلد ضخیم کتاب تیار ہو سکتی ہے۔

مگر امکان اس کا سچ پوچھئے تو اسی ابتدائی قاعدہ سے پیدا ہوا تھا، جس کا ذکر میں نے شروع ہی میں کیا تھا، یعنی حکومت کی آمدنی کی یا جن لوگوں کی حکومت تھی ان کی آمدنی سمجھی جاتی تھی، نہ کہ ان لوگوں کی جن کے سپرد حکومت کی باگ کر دی جائے،

اسی مثالی حکمران کے متعلق لکھا ہے کہ امیر خاندان میں پیدا ہوئے تھے، والد ان کے ملک مصر کے گورنر تھے، انتخاب سے پہلے ان کی زندگی امیرانہ تھی، ایک ایک قمیص کا کپڑا چار چار درم کا استعمال کرتے تھے، کھانے، پینے، رہنے، سہنے، الغرض زندگی کے تمام شعبے میں ان ہی امیرانہ عادتوں کے عادی تھے،

لیکن حکومت کی ذمہ داری جب سر پر آگئی تو اسی شخص کے اس لباس کا جسے جمعہ کے دن پہن کر منبر پر آئے تھے، جب حساب کیا گیا تو بارہ درم (ڈھائی روپے) سے زیادہ پورے لباس کی قیمت نہ ٹھہری، لکھا ہے اس لباس میں عمامہ بھی تھا، اور قمیص بھی قبا بھی، اور قرطق (کرتا) بھی موزے بھی اور چادر بھی،

عمدہ کھانے کے عادی تھے، مگر حکومت کے بعد اس کا میسر ہونا دشوار ہو گیا، چنے اور مسور کی دال ہی پر کبھی قناعت کرنی پڑتی ہے، پیٹ پھول جاتا، نفخ کی شکایت پیدا ہو جاتی، مگر صرف یہ فرما کر کہ

"لے پیٹ یہ تیرے گناہوں کا جنازہ ہے"

خاموش ہو جاتے،

ان کا غلام جنگلوں میں لکڑیاں اور ٹہنیاں تلاش کرتا پھرتا، کیونکہ بازار سے ایندھن خریدنے کی قیمت کبھی نہیں ہوتی، ایک دن اسی غلام نے جو اپنے وقت کی سب سے بڑی اقتداری طاقت کا غلام تھا، اسی نے ایک دن عرض کیا،

"آج ساری دنیا اچھے حال میں ہے، بجز آپ کے اور میرے"

اور یہی روح ہے مثالی حکومت کی، جس میں حکومت کی آخری اقتدار طاقت حکومتی آمدنی سے استفادے میں سب سے آخری ہستی سمجھی جاتی ہے،

یہ سیدنا حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ ہیں، جن کی حکمرانی کا زمانہ خواہ جتنا بھی مختصر ہو، لیکن صدیوں

بقیہ ص ۱۱ پر ملاحظہ فرمائیے

علیگڑھ کا ہنگامہ

مولانا محمد اسحاق صاحب ندوی

مسلم یونیورسٹی علیگڈھ کا ہنگامہ یقیناً قابل افسوس ہے مگر اس کے بعد جو اقدام حکومت کی طرف سے کیا گیا ہے وہ اس سے زیادہ افسوس ناک ہے۔

مسٹر چھاگلا اپنی خوشامدانہ، پست ذہنیت کے اعتبار سے خاصا نام پیدا کر چکے ہیں اور اپنے مسلم آزار طرز عمل سے بار بار تاریخی اسباق یاد دلا چکے ہیں۔ تازہ کارنامہ مسلم یونیورسٹی علیگڈھ کی رگ گلو پر بھرپور وار ہے۔ جس نے مسلمانان ہند کو تڑپا دیا ہے۔ اگر مسٹر چھاگلا کی جگہ کوئی ہندو وزیر تعلیم ہوتا تو شاید ایسی پست ذہنیت کا اظہار نہ کرتا، جس کا اظہار موصوف نے فرمایا ہے۔

یہ صحیح ہے کہ اس اقدام کی ذمہ داری پوری کابینہ پر عائد ہوتی ہے لیکن مسٹر چھاگلا کی، ذمہ داری بدو وجہ زائد ہے اول تو اس لئے کہ وہ وزیر تعلیم ہیں، دوسرے اس واسطے کہ انھوں نے کابینہ کے سامنے مسئلہ کی بہت غلط تصویر پیش کی ہے۔

یونیورسٹی پر فرقہ واریت اور رجعت پسندی کا الزام ایسا الزام ہے جس کے بار ثبوت سے وہ کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتے اور جو کچھ انھوں نے کیا اسے ملک کی خیر خواہی ہرگز نہیں کہا جا سکتا۔

ہندوستان کو اپنی رنگا رنگی پر ناز ہے مختلف فرقوں کی ثقافتوں کا موجود ہونا اور ہر فرقہ کے پاس ایسے اداروں کا ہونا جو ان کی، ثقافت کا نمونہ اور ان کے خصوصی امتیازات کا آئینہ ہوں۔ ہندوستان کے سیکولرزم کا ایک عملی ثبوت کہا جا سکتا ہے اور خود اس کی ایک امتیازی شان ہے جسے مسٹر چھاگلا مٹانا چاہتے ہیں ــــ

فرمایئے کیا یہ ملک کی خیر خواہی ہے یا بدخواہی؟ از روئے دستور مسلمانوں کو اپنے مخصوص ادارے قائم کرنیکا حق ہے۔ ان کی تعداد کروڑوں ہے، اس لئے بحیثیت مجموعی وہ ٹیکس میں بھی خاصی بھاری رقم دیتے ہیں اس لئے انھیں حکومت سے مالی امداد حاصل کرنیکا بھی حق حاصل ہے، یہی نہیں بلکہ وہ اپنی محنت وقابلیت کی وجہ سے ملک کی عام دولت میں خاصا اضافہ کرتے ہیں، پھر کیا وجہ ہے کہ وہ اپنے اداروں کے لئے خزانۂ حکومت سے امداد نہ حاصل کریں۔

آرڈیننس کے ذریعہ دستور کو معطل کر دینا کسی طرح کوئی مناسب کارروائی نہیں کہی، جا سکتی۔

یہ صحیح ہے کہ طلبہ کی روش قابل مذمت، ہے لیکن اس سے ایک اور بات کا بھی پتہ چلتا ہے کہ مسٹر علی یاور جنگ طلبہ اور اسٹاف میں مقبول نہیں ہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ ہر طالب علم مسٹر جنگ کو مارنے پر تلا ہوا تھا، لیکن اگر طلبہ کی ایک بڑی جماعت میں بھی وہ مقبول ہوتے تو چند طلباء کی یہ ہمت ہرگز نہ ہوتی کہ وائس چانسلر پر ہاتھ اٹھا سکتے۔

اب بھی وقت نہیں گیا ہے حکومت کو چاہیئے کہ آرڈیننس کو واپس لے، اور مسٹر علی یاور جنگ کو وائس چانسلر کے عہدے سے سبکدوش کر دے اس کے بعد کوئی ایسا وائس چانسلر تجویز کرے جو طلبہ اور اسٹاف میں مقبول ہو، اور جس کے اوپر ان سب کو اعتماد ہو اور جو مسائل کو صحیح روشنی میں دیکھ سکے۔

مسٹر چھاگلہ کو ہمارا مشورہ یہ ہے کہ وہ بھی اگر وزارت تعلیم کے بارے سے سبکدوش ہو جائیں تو یہ ان کے حق میں بھی مفید ہوگا اور مسلم اقلیت کے حق میں بھی -!

بلکہ سچ یہ ہے کہ ان کا وزارت تعلیم سے علیحدہ ہو جانا اور کسی منصف مزاج وسیع القلب شخص کا، ان کی جگہ پر مقرر ہونا پورے ملک کے حق میں مفید ہے۔

اس ہنگامے کا رشتہ فرقہ واریت سے جوڑنے میں بعض حضرات نے عجیب وغریب رویّہ اختیار کیا ہے، یہ لوگ اسے فرقہ وارانہ ہنگامہ بھی قرار دیتے ہیں اس کے ساتھ اس واقعہ کا انکار کرنیکی بھی جرأت نہیں کرتے کہ اس میں مسلمان اور ہندو دونوں فرقوں کے طلبۂ دوش بدوش تھے۔ مزید لطیفہ یہ ہے کہ جن دو طالبعلموں کو اس کا سرگروہ قرار دیتے ہیں ان میں ایک مسلمان اور ایک ہندو ہے۔

مسلمان کو جماعت اسلامی سے وابستہ بتاتے ہیں اور ہندو کو جس کا نام بھیم سنگھ ہے جن سنگھ سے۔

ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہئے

یہ عجیب قسم کی فرقہ واریت ہے جسمیں جن سنگھ اور جماعت اسلامی دونوں متحد ہو سکتے ہیں، یہ کھلا ہوا "تناقض بیان ہے جو درحقیقت اس بات کا نتیجہ ہے کہ ایک بالکل غلط اور بے بنیاد بات کو شہرت دینے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

مسئلہ بہت اہم ہے، اس کی طرف مسلمانوں کے تعلیم یافتہ طبقہ کو پورے طور پر متوجہ ہونا چاہئیے۔ خصوصاً جو حضرات مجالس قانون ساز سے تعلق رکھتے ہیں ان کی توجہ اور کوشش بہت ضروری ہے۔

اس وقت جبکہ ملک کو اتحاد ویکجہتی کی بہت زیادہ ضرورت ہے ایک تفرقہ انگیز مسئلہ چھیڑ دینا، حکومت بلکہ کسی محب وطن کے لئے مناسب نہیں کہا جا سکتا۔

اگر حکومت اس مسئلہ میں تدبر اور وسعت قلب سے کام لے تو یقیناً اس سے اس کے وقار میں اضافہ ہوگا اور مسلمانوں کے دلوں میں اسے ایک نئی جگہ حاصل ہو جائے گی۔

مرحوم ساتھی کے نام

قاضی شکیل عباسی ندوی

آتے ہیں شوق کے لمحات اب بھی
اٹھتے رہتے ہیں حجابات اب بھی

جو انھیں دور سے دکھلاتے تھے،
ہیں وہی نور کے لمحات اب بھی

جس کے دیدار سے محروم ہوں میں
اس سے ہوتی ہے ملاقات اب بھی

ان کی تابندہ نگاہی لے کر
آتی ہے تاروں بھری رات اب بھی

آسماں سے وہ مجھے جھانکتے ہیں
ملتے ہیں روح کو جذبات اب بھی

ساتھ رہتے تھے ہر اک محفل میں
اس عنایت کی ہے بہتات اب بھی

جذب دوری کو مٹا دیتا تھا
جذب میں ہے یہ کرامات اب بھی

شاخ شاخ ان کی دل آرائی ہے
ان سے معمور ہیں باغات، اب بھی

کہتے ہیں پونچھ کے آنسو میرے
تیری آنکھوں میں ہے برسات اب بھی

لوگ مرحوم کہے جاتے ہیں
زندہ جاوید کو ھیہات اب بھی

آج پھر چھپ گئے پردے میں حفیظ
اے شکیل ان کی ہے وہ بات اب بھی

ہمیشہ

چمکا ہی کیا نیّر اسلام ہمیشہ
تاریکیٔ باطل رہی ناکام ہمیشہ

اللہ کا لے نام بس اے مسلم مظلوم
رہنے کے نہیں یہ ترے آلام ہمیشہ

رحمت کا جو ملتا ہے تو صدقے میں نبیؐ کے
اللہ کے دربار سے انعام ہمیشہ

ہنس ہنس کے حوادث سے گزرتے رہے ہم لوگ
منہ تکتی رہی گردش ایام ہمیشہ

خون شہداء سے ہمیں ملتا ہے یہ پیغام
تلوار کے سایہ میں ہے آرام ہمیشہ

ممنون کرم آپ کا انسان رہے گا،
اے حضرت محبوب اسلامؑ ہمیشہ

جب عزم ویقیں کی نظر اک ہم نے اٹھا دی
کافور ہی دیکھے گئے اوہام ہمیشہ

ملتا ہے غم عشق پیمبرؐ ہمیں وارث
کرتے ہیں فسانہ میں وہی نام ہمیشہ

حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ کے ساتھ

ایک مبارک سفر

سید محمد ثانی حسنی

رجب سنہ ۶۲ھ کی کوئی تاریخ تھی اور جمعہ کا مبارک دن تھا، لکھنؤ میں قبر ماموں بھانجہ کی وسیع مسجد میں ایک تبلیغی اجتماع تھا جس میں حضرت مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تقریر تھی، یہ زمانہ وہ تھا جب کہ حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ ایک ہفتہ سے دار العلوم ندوۃ العلماء کے مہمان خانہ میں مقیم تھے اور آپ کے ہمراہ حضرت مولانا محمد زکریا صاحب شیخ الحدیث مدظلہ، دہلی کے مشہور بزرگ حافظ فخر الدین صاحب حضرت مولانا سید سلیمان صاحب ندوی، مولانا احتشام الحسن صاحب مولانا عبد الحق صاحب مدنی اور مولانا زبیر احمد صاحب اور تقریباً ۳۰، ۴۰ افراد دہلی کے تجار جو حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ کے معتمد علیہ اور آزمودہ کار تبلیغی کام کرنے والے میواتی تھے، حافظ مقبول احمد صاحب کی امارت میں دار العلوم ندوۃ العلماء کی وسیع اور کشادہ مسجد میں ہمہ وقت ذکر و تعلیم اور شام کو لکھنؤ کے مختلف محلوں میں گشت اور اجتماع کرتے رہتے تھے،

الغرض قبر ماموں بھانجہ کی مسجد میں تل رکھنے کی جگہ نہ تھی، ہر شخص ہمہ تن اشتیاق بنا تھا نماز جمعہ ہو چکی تھی مسجد کے درمیانی وسیع در میں جو صحن سے ملا تھا حضرت مولانا کی تقریر ہوئی، مولانا محمد منظور صاحب نعمانی کی تعارفی تقریر بھی ہوئی، تقریر کے بعد کانپور چلنے کی دعوت دی گئی، جیسا کہ عام قاعدہ ہے کہ لوگ تقریر کو تو بہت اشتیاق سے سنتے ہیں لیکن جب عملی پروگرام سامنے آتا ہے اور وقت دینے کا سوال پیدا ہوتا ہے تو سامعین اٹھنے لگتے ہیں، یہاں بھی ایسا ہوا، حضرت مولانا کھڑے ہوگئے اور لوگوں کو کانپور چلنے پر آمادہ کرنے لگے حضرت کی بے کلی اور بے چینی حد سے بڑھی ہوئی تھی، میں سامنے ہی قریب مجمع میں بیٹھا ہوا تھا، مولانا نے مجھکو اٹھنے کا حکم دیا میں گھبرا کر کھڑا ہوگیا، فرمایا خاموش کیوں بیٹھے ہو آس پاس کے لوگوں کو چلنے پر آمادہ کرو، لوگ اس دعوت کے عادی نہ تھے، دروازوں سے نکلنے لگے، حضرت مولانا بیتاب ہوگئے اور دروازے بند کردیئے اور ادھر ادھر چلنے لگے، جو سامنے ملتا اس کو کانپور چلنے کی دعوت دیتے،

اتفاق سے ایک معمر بزرگ جن کا نام حاجی ولی محمد تھا کھڑے تھے، ایک مسکین صورت اور غریب حال تھے حضرت مولانا نے ان سے بھی فرمایا کانپور چلئے وہ اس سے پہلے کام میں پوری طرح نہیں لگے تھے، کہنے لگے مولانا میں بواسیر کے مرض میں مبتلا ہوں چلنے پھرنے سے قاصر ہوں اور تکلیف سے مر رہا ہوں، حضرت مولانا نے ایک عجیب انداز اور پرسوز لہجہ میں فرمایا "مرنا ہے تو خدا کی راہ میں مرو"

یہ جملہ حاجی صاحب کے دل میں تیر کی طرح لگا، اور خدا کی راہ میں مرنے کو تیار ہوگئے اور کفن بردوش جماعت کے ساتھ ہولئے، لکھنؤ سے تقریباً دس بارہ حضرات تیار ہوگئے۔

دوسرے دن سنیچر سے کسی گاڑی سے جماعت روانہ ہوئی، یہ جماعت کیا تھی ایک کاروان یقین تھا جو پہلی بار صرف اس لئے باہر جا رہا تھا کہ خدا کا نام بلند ہو، اسکو نہ تو کانپور سے سودا لینا تھا نہ خرید و فروخت کرنی تھی نہ عزیز و اقارب سے ملنا تھا، اس جماعت میں تاجر بھی تھے جو اپنی دوکانیں بند کرکے جا رہے تھے، ملازم بھی تھے جو چھٹیاں لے کر جا رہے تھے، علماء بھی تھے جو درس و تدریس دو دن کے لئے ملتوی کرکے جا رہے تھے، ان پڑھ بھی تھے (جو حضرت مولانا کی پر اثر اور درد و سوز میں ڈوبی زبان سے یہ سنکر کہ اللہ کی راہ میں نکلنا دنیا کی ہر نعمت سے بڑھ کر ہے) گھر بار اور آرام و راحت کو چھوڑ کر ساتھ ہو لئے تھے،

اس مبارک سفر کی لذت بیان نہیں کی جا سکتی مجھکو جہاں تک یاد پڑتا ہے یہ میرا پہلا تبلیغی سفر تھا مخلصین و محبین کا ساتھ، جو ایک دوسرے پر جان چھڑکنے والے اور سراپا ایثار و قربانی تھے اور سب سے بڑھ کر حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے زیر سایہ یہ سفر ہو رہا تھا، یہ نعمت اپنی جگہ ایسی تھی کہ بعد میں آنے والے حضرات اسکی قدر و قیمت سمجھ سکتے ہیں اور جو اب لاکھوں روپے اور حکومت تک قربان کر دینے سے حاصل نہیں ہو سکتی میں اپنی خوبی قسمت پر جتنا بھی نازاں ہوں کم ہے۔

غرض کہ، محبت الٰہی اور عشق خداوندی سے سرشار یہ قافلہ کانپور پہونچا اور فیض عام کالج میں اس کا قیام ہوا جس کمرہ میں جماعت کا قیام تھا، وہ کوٹھے پر تھا تقریباً ۲۰-۲۵ زینے فاصلہ طے کرنے کے لئے درمیان میں پڑتے تھے اور بالکل سیدھے اور کھڑے، جہاں تک حافظہ کام کرتا ہے اس جماعت کے امیر میوات کے ایک بزرگ میاں عبد الرحمٰن تھے جو لوگ جماعتوں میں نکل چکے ہیں وہ اس راہ کے سفر کی لذت کو خوب جانتے ہیں جماعت کے سارے ارکان کام میں ایک دوسرے کا ہاتھ بٹاتے ہیں ان میں نہ کوئی چھوٹا ہوتا تھا نہ بڑا، اپنے کھانے کا انتظام خود کرتے ہیں، یہ جماعت بھی اپنے کاموں میں مشغول ہوگئی، وہی ذکر و تعلیم، باہمی خدمت اور گشت و اجتماع کانپور میں دو دن کا قیام رہا،

حاجی ولی محمد جنکا ذکر اوپر گزر چکا ہے، وہی جن کو بواسیر کی اتنی زیادہ شکایت تھی کہ ایک زینہ چڑھنا مشکل تھا، اب ۲۰ — ۲۵ زینے والی سیڑھی پر صبح و شام چڑھا اور اترا کرتے تھے، میں نے پوچھا حاجی صاحب کیا حال ہے ہنس کر فرمایا، ثانی صاحب کیا بتائیں مولانا کی زبان تھی کہ جادو کی پڑیا، تکلیف گویا کہ اڑن چھو ہوگئی، میں اپنا حال کیا بتاؤں لکھنؤ میں جب بھی کسی زینے پر چڑھنا ہوتا تھا تو جان نکل جاتی تھی اور بے حال ہو جاتا تھا، میں نے حضرت مولانا کے اصرار پر نام لکھا دیا اور خدا کے نام پر نکل پڑا مگر یہ سوچتا رہتا تھا کہ کہیں جماعت پر بار نہ بن جاؤں لیکن خدا نے ایسی شفا دی کہ اب ایک بار نہیں کئی کئی بار ایک زینہ نہیں ۲۰-۲۵ زینے چڑھتا ہوں اور اترتا ہوں

اور تکلیف کا احساس تک نہیں ہوتا، یہ مولانا کی کرامت ہے یا خدا کے دین کی برکت ہے، حاجی صاحب اپنی کمزوری اور طبعی نقاہت اور کبر سنی کے باوجود چاق و چوبند نظر آرہے تھے اور کہہ رہے تھے اس مبارک سفر نے اور حضرت مولانا کی دعا نے ایک نئی روح پھونک دی اب میں عہد کرتا ہوں کہ جب تک زندگی ہے یہی کام کروں گا، اور پھر یہی ہوا اس کام میں اپنی زندگی لگا دی اور آخر دم تک یہی مبارک کام کرتے رہے اور اسی راہ میں وطن سے دور اپنی جان دی، اللہ تعالیٰ حاجی صاحب کی بال بال مغفرت فرمائے۔

کانپور دو روزہ قیام میں ایک دن مسلم حلیم کالج میں ایک خصوصی اجتماع ہوا اس اجتماع میں کالج کا اسٹاف اور طلبہ ہال میں جمع ہوئے بلند جگہ پر کالج کے پرنسپل جناب عبد الشکور صاحب چند اساتذہ اور اسٹاف، حضرت مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ حضرت مولانا سید سلیمان ندوی اور قریب ہی میرے برادر مکرم مولانا سید ابو بکر صاحب، حسنی جو اسوقت مسلم حلیم کالج کے استاذ تھے، کرسی پر بیٹھے ہوئے تھے، حضرت مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ چونکہ لکھنؤ اور کانپور کے سفر کے درمیان صرف ایک شب کے لئے مولانا سید ابو الحسن علی صاحب کے ہمراہ میرے وطن تکیہ کلاں رائے بریلی تشریف لے گئے تھے اور وہاں حضرت سید احمد شہید رحمۃ کے خاندان کے افراد کے سامنے ایک پُر تاثیر تقریر فرمائی تھی، اور ارشاد فرمایا تھا، دین کا کام اگر، سادات نہیں کرینگے تو اسکو ترقی نہ ہوگی جو ان کے کرنے سے ہوتی اور اگر سادات دین کو چھوڑ کر کوئی دوسرا کام کرینگے تو انکو وہ حقیقی چین نصیب نہ ہوگا جو اپنا فطری کام کرنے میں ہوتا ہے۔

مولانا سید ابو بکر صاحب حسنی بھی اسی خانوادہ سے تعلق رکھتے ہیں اس لئے حضرت مولانا نے تعارف کے بعد ان کے کاندھوں یا سر پر اپنا مبارک ہاتھ رکھکر فرمایا سید صاحب! یہ مبارک کام آپ حضرات کے کرنیکا ہے سادات ہی اس کے حقدار ہیں،

اس اجتماع میں حضرت سید سلیمان صاحب ندوی کی تقریر ہوئی اور بڑی برجستہ اور شستہ تقریر فرمائی، ادھر سید صاحب علیہ الرحمۃ کی تقریر اپنے شباب پر تھی ادھر حضرت مولانا محمد الیاس صاحب کی بے کلی اور بے تابی بھی اپنے عروج پر تھی وہ بار بار حضرت سید صاحب کو لقمہ دیتے اور اپنی بات کہہ دیتے، حضرت سید صاحب فوراً خاموش ہو جاتے اور بڑے ادب سے حضرت مولانا کے کلام کو سنتے اور دہرا دیتے، ممکن ہے بعض لوگوں کو یہ احساس ہو کہ جب ایک تقریر ہو رہی ہو تو بیچ میں لقمہ دینا اور اپنی بات کہنا کہاں روا ہے جو لوگ حضرت مولانا کی بے چینی بے کلی، اور سیمابی کیفیت کو جانتے ہیں وہ اس کا جواب خود معلوم کر سکتے ہیں جس شخص کی بیتابی اور بیقراری کا عالم یہ ہو کہ

لے برق تو ذرا کبھی تڑپی ٹھہر گئی ٭ یاں عمر کٹ گئی ہے اسی اضطراب میں

وہ کیسے ایک حالت پر رہ سکتا ہے۔

جب حضرت مولانا کا بیان ہوا تو مجمع آبدیدہ تھا، حضرت مولانا کی زبان میں لکنت تھی اپنی بات سمجھا نہیں سکتے تھے، ایک نحیف الجثہ انسان زبان لکنت زدہ الفاظ صاف نہیں لیکن ہر شخص ہمہ تن گوش تھا اور حضرت مولانا سید سلیمان صاحب ندوی کا حال سب سے جدا تھا، سر جھکائے ہوئے تھے، ہاتھوں میں رومال اور آنکھیں اشکبار تھیں، جسم پورا متحرک تھا بار بار آنسو پونچھتے تھے یہ کیفیت آخر کہاں تک رہی اس سفر کے بعد حضرت سید صاحبؒ حضرت مولانا محمد الیاس صاحب سے بہت زیادہ قریب ہوگئے اور بڑے اچھے الفاظ میں تذکرہ فرماتے۔

دوسرے دن بساطی بازار کی خوبصورت مسجد میں قیام ہوا، حضرت مولانا کا قیام بالائی حصہ کے ایک کشادہ کمرہ میں تھا ہمراہی میں بعض دوسرے علماء تھے باقی جماعت کا قیام نیچے ایک دالان میں تھا، اس دن ایک عجیب واقعہ پیش آیا جو یقیناً حضرت مولانا کے کشف و کرامت کا نتیجہ تھا، خال مکرم حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندوی کی وجہ سے مجھ پر شفقت فرماتے تھے، میں جماعت کے ساتھ ٹھہرا تھا، دوپہر کا وقت تھا اسوقت معلوم کیا بات تھی جواب یاد نہیں رہی، امیر جماعت نے کھانے میں بجائے روٹی اور گوشت وغیرہ کے ہر فرد کو ایک ایک آم اور روٹی دی کہ ملکر سب لوگ کھاؤ میں اس نئے کھانے کا بالکل عادی نہ تھا، میں نے روکھا آم کھا لیا اور ایک طرف کھڑا ہوگیا، تھوڑی ہی دیر میں ایک صاحب آئے اور مجھکو دریافت کرتے کرتے مجھ تک پہونچے اور کہا کہ حضرت یاد کر رہے ہیں، میں گھبرا کر اوپر پہونچا مسکرا کر فرمایا تم میرے پاس آؤ، شفقت سے پاس بٹھایا اور فرمایا لو کھاؤ اسوقت کھانے پر کے خواص جمع تھے منشی محمد سعید صاحب کانپوری بھی تھے، ان کے علاوہ مجھکو یاد نہیں کہ اور کون کون تھا؟

شام کو بعد عصر مسجد میں اجتماع ہوا — اور مظاہر علوم کے مدرس مولانا امیر احمد صاحب کاندھلوی کی تقریر ہوئی، افسوس ہے کہ مولانا امیر احمد صاحب کا بھی ذوالحجہ کے مہینہ میں انتقال ہوگیا، حضرت مولانا قریب ہی بیٹھے تھے، مولانا امیر احمد صاحب نے تقریر شروع کی، ابھی چند ہی الفاظ کہے تھے کہ حضرت مولانا کھڑے ہوئے اور فرمایا مولوی امیر احمد ٹھہرو اور اپنی بات کہنے لگے، پھر فرمایا اچھا اپنی بات کہو، مولانا امیر احمد صاحب تقریر کرنے لگے ذرا دیر بعد پھر حضرت مولانا محمد الیاس صاحب کھڑے ہوگئے اور روک کر اپنی بات کہنے لگے، کئی بار ایسا ہوا آخر میں مسکرا کر فرمایا اچھا میں اب نہ بولوں گا تم ہی کہو،

یہی بے کلی تھی، حضرت مولانا کی جو ہر وقت رہتی تھی اور باوجود لکنت و عدم قدرت کے دیر تک لوگوں کی اکتاہٹ سے صرف نظر کرکے حضرت مولانا کو کھڑا کر دیتی تھی اور کسی پہلو قرار و سکون نصیب نہ ہوتا۔

اس دو روزہ قیام نے نہ معلوم کتنے دلوں کی دنیا بدل دی ہے، کتنوں کو یقین بخشا اور ایمان سے لذت یاب کیا، حضرت مولانا کو آج دنیا سے گئے "اکیس" سال ہوگئے ہیں، اس سفر کے بعد حضرت مولانا جلد ہی رخصت ہوگئے لیکن اس سفر کی لذت و تاثیر ابھی تک تازہ ہے۔

بقیہ: ایک مثالی حکومت

قائم رہنے والی حکومتوں کیلئے ان کی "مثالی حکومت" پہلے بھی قابل رشک تھی اور جب تک الدین یا انسان کی زندگی پر پولیس و فوج کی نگرانی کے ساتھ اللہ کی نگرانی کا یقین مسلط نہ ہوگا ان کی یہ مثالی حکومت آئندہ بھی قابل رشک رہیگی کیونکہ جب تک الدین اللہ کے اصول کو نافذ کر کے خواص و عوام کو اس راہ پر نہیں لائیں گے، نفاذ کارگر نہیں ہو سکتا۔

گاندھی جی نے بھی حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی حکومت کو مثالی حکومت قرار دیکر مطالبہ قرار دیا تھا کہ اسی کو چاہئے کہ نمونہ بنایا جائے میرے خیال میں اسی کے ساتھ حضرت عمر بن عبد العزیز کے نام کا بھی اضافہ ہونا چاہئے۔

تاریخ کے دریچے سے

ابودجانہ

سید الرحمٰن الاعظمی

غار حرا سے آنے والی اس آواز کو سنو جو زندگی کی حقیقت لوگوں پر واضح کررہی ہے یہی وہ آوازۂ حق ہے جس کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بلند کیا اور جس نے کائنات کے رخ سے پردہ کو ہٹایا، قبیلۂ خزرج کے شہسوار اور راہ حق کے مسافر ابودجانہ نے اس آواز کی گونج سنی تو بے چین ہو گئے جیسے ان کو اپنا گوہر مقصود نظر آگیا ہو، وہ اس کی طرف لپکے، اور آگے بڑھ کر انھوں نے اس آواز پر لبیک کہا۔

وہ اسلام کی نعمت سے سرفراز ہوئے تو دنیا ان کی تلوار کے سایہ سے ڈرنے لگی اور ان کو وہ لازوال دولت ہاتھ آئی جس سے وہ ابتک محروم تھے۔

ابودجانہ سماک بن خرشۃ مسلمان ہوئے تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو صحابہ کی صف اول میں جگہ دی۔ لیکن ابودجانہ کے ایمان پر کبر و غرور کا کوئی سایہ نہیں منڈلایا، وہ اسی طرح متواضع ویسے ہی خاکسار اب بھی رہے جس طرح پہلے تھے۔ ایمان کی بشاشت سے معمور سینہ۔ اللہ و آخرت کے یقین سے معمور قلب۔ خشوع و خضوع کے نور سے شفاف روح۔ یہ تھیں وہ صفات جو خزرج کے اس شہسوار میں موجود تھیں، اور آج بھی اس کا نام عرب کے صحرا و بادیہ میں ہر جگہ گونج رہا ہے۔

جبل احد کے دامن میں ایک جھنڈا نمودار ہوا۔ پیغام حق اور رسول برحق کا جھنڈا جس کی بلندی کو کوئی طاقت شکست نہیں دے سکتی تھی جھنڈا اعلان جنگ کے ساتھ فضاؤں میں لہرایا۔ مسلمانوں کا لشکر کفار کے عظیم لشکر سے ٹکرایا، لشکر کے وسط میں ابودجانہ سر پر سرخ پٹی باندھے ہوئے شعلہ کی طرح دشمن پر ٹوٹ پڑے۔

قریش کا لشکر اس شعلہ کی تاب نہ لا کر بھاگنے لگا۔ ابودجانہ انتہائی بے جگری کے ساتھ دشمن کی صف میں گھس کر اپنا جوہر دکھاتے رہے اور احد کے دامن میں خزرج کے شہسوار کا کارنامہ جریدۂ تاریخ پر ثبت ہوگیا اور اسلامی تاریخ میں ایک ہیرو کا اضافہ ہوگیا۔

مسلمانوں کے لشکر میں رسول اکرم علیہ الصلاۃ والسلام کا جھنڈا ایک دفعہ لہرایا، اور ایک آواز فضا میں گونجی اس تلوار کا حق کون ادا کر سکتا ہے؟ کون اس تلوار کو لیتا ہے؟

مسلمانوں کے تمام شہسوار تلوار لینے کے لئے آگے بڑھے آپ نے کسی کو نہیں دیا۔ شہسواروں نے آپ سے دریافت کیا کہ اس تلوار کا کیا حق ہے؟ آپ نے فرمایا:

دشمن کو اس طرح مارا جائے کہ وہ اٹھ نہ سکے

یہ سن کر سب لوگ خاموش ہوگئے۔ لیکن ابودجانہ فوراً ہی اٹھ کر بولے۔ یا رسول اللہ میں اس تلوار کا حق ادا کرنے کے وعدہ کے ساتھ اس کو لینا چاہتا ہوں۔

آپ نے تلوار دے دی

ابودجانہ نے سرخ پٹی نکالی اور اپنے سر کو اس سے باندھ لیا۔ انصار کی جماعت نے کہا کہ ابودجانہ نے موت کی پٹی باندھ لی۔

اتنے میں دونوں لشکروں کے درمیان پھر جنگ شروع ہوگئی۔ ابودجانہ نے اپنا جوہر دکھانا شروع کیا۔ کافروں کا لشکر بھاگنے لگا۔ قریش کے بہادر مقتول ہو کر گرنے لگے ایک کافر کی چیخ نے ان کے ہاتھ کو روک دیا۔ دیکھا تو وہ ایک عورت تھی۔ ابودجانہ نے اس کو یہ کہہ کر چھوڑ دیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تلوار اس سے بہت بلند ہے کہ وہ کسی عورت کو قتل کرے۔

لشکر میں ایک نغمہ گونجا۔ آواز میں انتہا درجہ کی شیرینیت اور مٹھاس محسوس ہو رہی تھی۔ سب کے کان متوجہ ہوگئے۔ لوگوں نے سنا کہ ابودجانہ یہ شعر پڑھ رہے تھے۔

"مجھ سے میرے محبوب نے نخلستان کے قریب یہ وعدہ لیا ہے کہ میں اللہ اور اس کے رسول کی تلوار سے کبھی کسی بزدل کو نہیں قتل کروں گا۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جھنڈا پھر لہرایا اس وقت کچھ لوگ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑ کر بھاگ رہے تھے لیکن جو لوگ ثابت قدم رہے ان میں ابودجانہ سب سے آگے تھے، اور کفار کا لشکر جب بھی آگے بڑھتا اور حضور اکرم کو کوئی تکلیف پہونچانا چاہتا تو ابودجانہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ آگے بڑھ کر ان کا خاتمہ کر دیتے۔ دیکھتے دیکھتے قریش کا لشکر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر ہر طرف سے پل پڑا اور تیر برسانے لگا تو ابودجانہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی حفاظت میں لے لیا، اور قریش کا تیر ان کی پیٹھ پر برستا رہا۔

ابودجانہ حضور کے لئے ڈھال بنے ہوئے تھے۔ نہ کسی تکلیف کا احساس تھا نہ زخم کی پرواہ۔ انھوں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے موت پر بیعت کی اور آپ کے لئے اپنی جان کو یہ کہتے ہوئے ہبہ کر دیا۔

"میری جان آپ کی جان کے لئے اور میری آنکھ آپ کی آنکھ کے لئے ڈھال ہے۔"

قریش کا لشکر فدائیت کا یہ منظر دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا۔ لیکن وہ صحابۂ کرام کی بہادری کو دیکھ کر بھی عبرت نہیں حاصل کر سکا، وہ بہادر ابودجانہ کی قوت ایمان کے سامنے بھی اپنے کفر کو خیرباد کہنے پر راضی نہیں ہوا۔

صرف جبل احد کے دامن میں خزرج کے شہسوار ابودجانہ نے یہ جوہر نہیں دکھایا بلکہ وہ ہر واقعہ اور ہر معرکہ میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہے اور ہمیشہ ایک ممتاز سپاہی کی حیثیت سے انھوں نے اپنا فرض انجام دیا اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے زمانے میں جب بنو حنیفہ مرتد ہوئے اور مسلمانوں کا لشکر ان سے لڑنے کے لئے نکلا تو وہاں بھی ابودجانہ شیر کی طرح حملہ کرتے ہوئے نظر آئے۔ بنو حنیفہ کے بڑے بڑے سردار ان پر حملہ آور ہوتے اور وہ سب کو ایک وار میں ختم کر دیتے تھے۔

جب مشرکین اخیر میں قلعہ بند ہوگئے اور مسلمانوں کے لشکر نے ان کا محاصرہ کیا تو اس میں بھی ابودجانہ سب سے آگے رہے اور برابر کوشش کرتے رہے۔ یہاں تک کہ وہ قلعہ میں داخل ہوگئے۔ گھمسان کی لڑائی شروع ہوئی۔ ابودجانہ کی تلوار اپنا جوہر دکھانے لگی۔

اسی اثنا میں ابودجانہ زخمی ہوگئے۔ لیکن وہ اپنی جگہ سے نہیں ہٹے، برابر لڑتے رہے تا آنکہ ان کا قدم زخموں کی تاب نہ لا کر لڑکھڑایا، ابھی فتح کے نقوش ابھر ہی رہے تھے کہ وہ شہید ہوگئے۔ اور تاریخ نے ان کی سرفروشی، اور ان کی جانبازی کے قصہ کو ہمیشہ کے لئے محفوظ کر لیا۔ اور جریدۂ عالم پر ان کا دوام ایک حقیقت بن کر ثبت ہوگیا۔

انٹرویو

مولانا محمد اسحاق صاحب سندیلوی

مجلس تحقیقات شرعیہ دار العلوم ندوۃ العلماء

یونس نگرامی ندوی

ندوہ میں اپنے تعلیمی ایام میں جن اساتذہ کی شفقت اور محبت میرے اوپر رہی، ان میں سب سے زیادہ حضرت مولانا محمد اسحاق صاحب سندیلوی کی ذات گرامی میرے لئے ہمیشہ شفقت و رحمت کی علامت رہی، میں نے مولانا کی ذات میں ہمیشہ ایک شفیق اور ناصح استاد اور ایک رحمدل باپ کی صفات پائیں

زندگی کے مسائل پر مولانا کی نگاہ کس قدر اہم ہے اور اسلام اور مسلمانوں کی زبوں حالی پر ان کا دل کس قدر خون ہے اس کا علم بہت کم لوگوں کو ہے — مستشرقین یورپ کس طرح سے اسلامی تعلیمات کے جسم میں زہر کے انجکشن لگا رہے ہیں اور اس کو مسخ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں ان تمام باتوں کا علاج کیا ہو سکتا ہے۔ یہ سب خیالات اس اللہ کے بندے کے ذہن میں آتے ہیں، لیکن افسوس کہ اس کے پاس وسائل نہیں جس سے ان کا سد باب ہو سکے،

آگے ناظرین ایک انٹرویو ملاحظہ فرمائیں گے اس سے خود بخود اندازہ ہو جائے گا کہ آجکل ملت اسلامیہ پر حملے اور اس کو پست تر بنانے کی کیا کیا کوششیں ہو رہی ہیں۔

ایک موقع پر مولانا سے گفتگو کے دوران میں نے دریافت کیا کہ مطالعہ کا ذوق پیدا کرنے کے لئے کیا ذرائع اختیار کئے جائیں، مولانا نے فرمایا کچھ دنوں تک تو طبیعت پر جبر کر کے مطالعہ کیا جائے تھوڑے ہی دنوں میں انشاء اللہ دلچسپی پیدا ہو جائے گی۔

دوسرے یہ کہ ان چیزوں سے بچنے کی کوشش کرنا چاہئے، جو ذوق مطالعہ میں مانع ہوں، علمی ذوق رکھنے والوں کی صحبت اختیار کی جائے، مولانا یہ فرماتے کہ ٹھوس استعداد پیدا کرنے کے لئے کیا طریقہ اختیار کیا جائے، مولانا نے فرمایا — دیکھئے ہر علم و فن میں مطالعہ نظری ترتیب سے ہونا چاہئے، پہلے سہل اور مختصر اور تدریجاً مفصل اور مشکل کتابوں تک پہونچنا چاہئے، اس ترتیب سے مطالعہ میں عمق اور گہرائی پیدا ہوتی ہے۔

مولانا یہ فرمائے کہ موجودہ دور میں مسلمانوں کے ذہن و دماغ پر کس انداز سے حملے ہو رہے ہیں اور اس کی نوعیت کیا ہے،

میرے اس سوال پر مولانا نے جو کچھ فرمایا ہے وہ ہر صاحب فکر کیلئے دعوت غور و فکر ہے،

مولانا نے فرمایا کہ اسلام کی مدح و ستائش کے بعد اس طرح زہر دیا جاتا ہے کہ باوجود ہزار خوبیوں کے اسلام پرانا ہو چکا ہے اور زمانہ کی تبدیلیوں کا ساتھ نہیں دے سکتا ہے، اس کے علاوہ پوری کوشش حیوانیت کو برانگیختہ کرکے آخرت کو بھلانے پر صرف کی جاتی ہے، پھر ریسرچ و تحقیق کی آڑ لیکر اور کورانہ تقلید کا طعنہ دیکر دین کی کسی بات میں شک پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ چنانچہ نفسیاتی اصول کے ماتحت ایک مسئلہ میں شک دوسرے مسائل میں شک کی دعوت دیتا ہے۔ مسلمانوں کے دلوں سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے ساتھیوں کی عظمت کم کرنے کی کوشش کی جارہی ہے،

دشمنان دین کا ایک حربہ یہ ہے کہ غیر اسلامی تہذیب و ثقافت کی خوبیاں بیان کرکے اسلامی تہذیب، کو نظروں سے گرانے کی کوشش کرتے ہیں مگر پوری احتیاط ملحوظ رکھتے ہیں کہ اسلامی عقائد پر کوئی اعتراض نہ کیا جائے تاکہ مسلمانوں کے جذبات کو ٹھیس نہ لگے،

رفتہ رفتہ جب غیر اسلامی تہذیب و ثقافت رائج ہو جاتی ہے اور مسلمان اسے اسلامی تہذیب و ثقافت پر ترجیح دینے لگتا ہے تو اصول اسلام میں شک و شبہ پیدا کر دینا کوئی مشکل کام نہیں رہتا ہے

اس سوال کے بعد میں نے مولانا سے عرض کیا کہ اسلام کے بارے میں عمومی تعارف اور اس کی تعلیمات کو سمجھنے کے لئے آپ کس کتاب کو بہتر سمجھتے ہیں۔

مولانا نے فرمایا کہ اسلام کے بارے میں عمومی تعارف اور اس کی تعلیمات کو سمجھنے کے لئے علامہ سید سلیمان ندوی رح کی سیرۃ النبیؐ سے بہتر کوئی کتاب نہیں ہے

بقیہ اہم تاریخی حقیقت

مرکزی سلاطین میں سکندر لودھی (م ۹۲۳) جیسا نیک نفس علم کا سرپرست و قدرداں، شیرشاہ سوری (م ۹۵۲) جیسا منتظم و مدبر اورنگ زیب (م ۱۱۱۸) جیسا صاحب دماغ اور فاضل بادشاہ نظر آتا ہے، صوبجات کی آزاد حکومتوں میں ابراہیم شرقی (م ۸۴۴) جیسا علم کا قدرداں احمد شاہ گجراتی (م ۸۴۵) جیسا منتظم محمود (م ۹۱۷) و مظفر حلیم (م ۹۳۲) جیسے فرشتہ سیرت بادشاہ، محمود گاواں دکنی (م ۸۸۶) خداوند اختیار خاں، عبدالعزیز، آصف خاں، نواب فرید جیسے جیسے فاضل وزیر اور عبدالرحیم خان خاناں جیسے باکمال سعد اللہ خاں نظام الملک آصف جاہ جیسے خوش تدبیر وزیر نظر آتے ہیں جس قوم میں ہر شعبہ اور ہر صنف میں ایسے باکمال پیدا کئے اس کی ذہنی و علمی قوتوں کو کس طرح تسلیم کیا جائے۔ (باقی آئندہ)

نادر شاہ کا

دھلی میں فاتحانہ داخلہ اور قتلِ عام!

(از حافظ محمد حسان علوی بی، اے، (ورانیو) اے)

دھلی کے عوام بھی باہری دنیا سے اتنے ہی لا پرواہ تھے جتنے شاہی دربار کے لوگ، عوام نے ایرانی دہشت اور حیوانیت کا اندازہ لگایا ہی نہیں تھا اور نہ ہی ان لوگوں کو اس سے پہلے کوئی ایسے کے روپ میں ایک قزاق کی ذہانت اور چالاکیوں کا اندازہ تھا، ایک ایسا قزاق جو ان کے ملک میں شاہانہ کروفر کے ساتھ داخل ہو چکا تھا، ہندوستانی فوج کی مسلسل پیش قدمی کا عوام نے غلط مطلب نکالا اور اپنی فوج پر انتہائی سے زیادہ اعتماد کر کے بڑے اطمینان سے بیٹھ رہے اور حفاظتی تدابیر سے بھی آنکھیں پھیر لیں، ۱۹ر جنوری ۳۹ء کو شہنشاہ کا سکریٹری آنند رام شہنشاہ کی روانگی کے ایک دن کے بعد شاہی فوج کے ساتھ ہمرکاب ہونے کیلئے جب دھلی پہونچا، تو اس نے یہ مشاہدہ کیا کہ دھلی کا ہر شخص، خواہ وہ بوڑھا ہو یا جوان، امیر ہو یا غریب، کی یہی خواہش تھی کہ وہ اس مہم میں شامل ہو جائے، کچھ لوگ تو یہ خواہش رکھتے تھے کہ اسی بہانے پنجاب کی سیر ہو جائے گی اور کچھ لوگ یہ خیال کر کے جانا چاہتے تھے کہ "ہندوستانی فوج کو شہر کے قریب ہی فتح میسر آ جائے گی اور جلد وہ لوگ بہت جلد ہی واپس آ جائیں گے"۔

لیکن ایک دن چونکا دینے والی حقیقت سامنے آ گئی، ۱۵ر فروری کی صبح کو یہ خبریں دھلی پہونچیں کہ "دو روز قبل دشمن کی فوج فتحیاب ہو چکی ہے، اور شاہی فوج کے دو زبردست دستے مع اپنے سپہ سالاروں کے یا تو مار ڈالے گئے ہیں یا قید کر لئے گئے ہیں اور شہنشاہ کا کیمپ لوٹا جا چکا ہے"۔

دھلی کی آبادی مختلف النسل لوگوں سے بھری ہوئی تھی، ایک گروہ یہاں ایسا بھی موجود تھا جو ہر وقت غارت گری اور لوٹ مار مچانے کے مواقع تلاش کیا کرتا تھا، گو جب اور دوسرے لیٹرے بھی دولت سے بھرے ہوئے بازار، لوٹنا شروع کر دیتے تھے، جب کبھی بھی شاہی دربار کے مفلوج ہونے یا عارضی طور سے کمزور ہونیکی خبریں ان لوگوں کو ملتی تھیں، تو بس یہ لوگ موقعہ غنیمت جان کر اپنے کاموں میں لگ جاتے تھے!

لیکن دہلی پولس کا ناظم اعلےٰ حاجی فولاد خان بہت ہی عقلمند، طاقتور اور مضبوط ارادوں کا مالک شخص تھا، اس نے شہر کی حفاظت میں دن رات ایک کر دئیے اور فتنہ پردازوں کو موقع پر پہونچکر سخت سے سخت سزائیں دیں، اسی دوران شہر کی بڑی سڑک کو ڈاکوؤں نے چاروں طرف سے گھیر لیا اور اس طرح شہر سے باہر رہنے والوں کا جان و مال غیر محفوظ ہو کر رہ گئے۔ عوام میں جو صاحب حیثیت لوگ تھے، ان لوگوں نے اپنے گھروں کی حفاظت کے لئے مسلح پہرہ دار مقرر کر رکھے تھے اور اپنی طرف کی ساری سڑکوں کو خوب اچھی طریقے سے گھیر کر چاروں طرف پشتے باندھ دئیے تھے، اور بارود وغیرہ بھی اچھا خاصا جمع کر لیا تھا، اور کبھی کبھار فتنہ پردازوں کو ڈرانے دھمکانے کی غرض سے ایک آدھ گولہ بھی چھوڑ دیتے تھے تاکہ ان کے گھر اور خاندان محفوظ رہ سکیں اور یہ لوگ اس طرف کا رُخ نہ کر سکیں، بارہ روز اسی حالت میں گزر گئے، جب سعادت خان اپنی چار ہزار فوج کے ساتھ دہلی میں داخل ہوا تو اس قسم کی غیر قانونی باتیں اور فتنے ایک جگہ جم کر رہ گئے۔

(آنند رام ص ۴۱، ۳۹)

ایک دن نادر کے بعد نادر شاہ نے تہماسپ خان جلایر کو اپنے مدار المہام کی حیثیت سے چار ہزار فوج کی ہمراہی میں مکمل طور سے دہلی میں نظم و نسق اور دوسرے انتظامات کیلئے روانہ کر دیا تھا، سعادت خان پہلے ہی شہنشاہ کے نمائندہ کی حیثیت سے دہلی پہونچ چکا تھا اور نادر شاہ کے شایانِ شان استقبال کی تیاریوں میں لگ گیا تھا اور عوام کو بھی اس بات کے لئے تیار کر رہا تھا کہ وہ لوگ بھی ایرانی بادشاہ کا شاندار استقبال کریں اور ساتھ ہی اس بات کی بھی سختی کے ساتھ روک تھام کر رہا تھا کہ شہنشاہ کی تبدیلی کی وجہ سے کسی قسم کی سازش نہ ہو اور شاہی ساز و سامان کی بربادی بھی نہ ہو!

یہ دونوں امرائے سلطنت ۲۷ر فروری کو دہلی پہونچ گئے تھے، یہ لوگ اپنے ساتھ محمد شاہ اور نادر شاہ کے خطوط شہر کے گورنر لطف اللہ خاں کے لئے لائے تھے، شہنشاہ نے لطف اللہ خاں کو لکھا تھا کہ "وہ شاہی خزانہ، شاہی ذخیرے کی ساری کنجیاں تہماسپ خان کے حوالے کر دے اور شاہزادگان کی خوب اچھی طرح نگہبانی کرے تاکہ وہ لوگ کسی قسم کی غیر قانونی حرکت نہ کریں" اور نادر شاہ نے اپنے خط میں لطف اللہ خان کی دیانت داری اور اپنے ملک کے ساتھ وفاداری کی بڑی تعریف کی تھی اور اپنی طرف سے اس کے عہدہ کی توثیق کر دی تھی!

لطف اللہ خان دہلی کے چاروں طرف خندقیں کھود کر حفاظتی تدابیر میں مصروف تھا کہ اسی دوران سعادت خان کا خط اس کو ملا، سعادت خان نے یہ خط دہلی سے ایک میل پہلے ہی رک کر اس کو لکھا تھا کہ "سلامتی اسی میں ہے کہ وہ شہر اس کے حوالہ کر دے، جنگ بالکل بیکار ثابت ہوگی" اس طریقے سے گورنر نے شہر اس کے حوالہ کر دیا (شاکر علی)

جب کرنال میں دونوں بادشاہوں کو دہلی پر مکمل قبضہ کی خبریں ملیں، تو یہ دونوں آگے پیچھے چند میل کر کے ایک منزل آگے کی طرف بڑھ آئے، محمد شاہ اخلاق کی رو سے نادر شاہ سے چند قدم پیچھے چل رہا تھا۔ اس وقت شہنشاہ کے پاس صرف ایک ہزار سوار تھے اور اس کے وزیر کی ہمراہی میں دس ہزار پیادہ فوج کے سپاہی تھے۔

بلین دے اپنی ڈائری میں لکھتا ہے کہ:۔

"نادر شاہ تین لاکھ پچاس ہزار فوج کی ہمراہی میں دہلی کی طرف آ رہا تھا، اور اس کی فوج ۱۲ میل لمبائی اور تین میل چوڑائی میں چل رہی تھی" (ص ۲۴۳)

شہنشاہ کی بقیہ فوج کے سپاہی نادر شاہ کے حکم کے مطابق ۲۵ر فروری کو اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہو چکے تھے!

۷ر مارچ کو محمد شاہ اپنی تھوڑی سی فوج کے ساتھ دہلی کے جنوب میں شالیمار باغ پہونچ گیا تھا اور اسی کے ساتھ نادر شاہ بھی۔ سعادت خاں ایک روز پہلے ہی نادر شاہ کا استقبال کرنے کے لئے شہر سے باہر آ گیا تھا، ۷ر مارچ کی شام کو لطف اللہ خاں شالیمار باغ میں شہنشاہ سے ملاقات کیلئے پہونچا شہنشاہ نے نادر شاہ سے اس کا تعارف کرایا ایرانی بادشاہ لطف اللہ خان سے ملکر اس قدر خوش ہوا کہ اس نے اپنے جسم سے ایک بہت ہی قیمتی کوٹ اتارا اور اپنے ہاتھوں سے اسے پہنا دیا۔ ایرانی فوج اور نادر شاہ نے ۸ر مارچ تک باغ میں قیام کیا، اور اسی دوران محمد شاہ اس عظیم مہمان کی شایانِ شان استقبال کی تیاریاں کرنے کیلئے شہر میں داخل ہو چکا تھا۔

شہنشاہ بابر اور شہنشاہ اکبر کا زوال پذیر وارث بہت ہی خاموشی اور سنجیدگی کے ساتھ تخت رواں پر سوار دار السلطنت میں داخل ہوا نہ کوئی جھنڈ بجایا گیا اور نہ ہی کسی قسم کے جھنڈے اس کے آگے آگے لے جائے گئے، جاوید خان، بہروز خان اور اسحاق خان جیسے اُمرائے سلطنت اس کے ساتھ تھے!

دوسرے دن بروز جمعہ ۹ر مارچ کو فاتح اعظم ایک بھورے رنگ کے جنگی گھوڑے پر سوار دہلی میں داخل ہوا، اسی کی فوج شالیمار باغ سے لیکر دہلی کے محل تک دو رویہ قطار بنا کر کھڑی تھی، شہنشاہ نے اپنے فاتح کا استقبال کیا، اسکے استقبال کے لئے سونے کا کام بنی ہوئی قیمتی ترین قالین زمین پر بچھائی گئی تھی، اور پا اندازی کیلئے بھی بہت ہی قیمتی چیزیں زمین پر رکھی گئی تھیں نادر شاہ نے شہنشاہ شاہجہاں کے دیوان خاص سے ملے ہوئے ایک کمرہ میں سکونت اختیار کی، اُس دن شہنشاہ نے میزبان ہونے کی حیثیت سے نادر شاہ کے سامنے کھانا پیش کیا جسمیں ہندوستانی باورچیوں کے پکائے ہوئے انواع و اقسام کے کھانے موجود تھے، ایرانی فوج بھی خیمہ زن ہو چکی تھی، کچھ تو قلعہ کے چاروں طرف اور کچھ شہر میں جمنا کے کنارے اور کچھ ۔۔۔ کے مکانوں میں قیام پذیر ہوئی (علی حزیں اور جہانکشائے نادری ص ۳۵۵)

سعادت خاں سارے دن نادر شاہ کی خدمت میں لگا رہا، رات کے وقت نادر شاہ نے اس کو طلب کیا اور بہت بُری طرح سے ڈانٹا کہ اس نے اب تک اپنے کئے ہوئے وعدہ کے مطابق تاوانِ جنگ کیوں نہیں ادا کیا، اور اگر وہ اپنے وعدوں پر قائم نہ رہا تو وہ اس کو سخت سزا اپنے طور سے دیگا یہ بات سعادت خاں کے لئے بہت ہی سخت ثابت ہوئی وہ اپنے گھر چلا گیا۔ اور وہاں اس نے زہر کھا لیا!

۱۰ر مارچ بقرعید کا دن تھا، بادشاہ کی حیثیت سے نادر شاہ کا نام اور خطابات جامع مسجد کے منبر سے خطبہ میں پڑھے گئے، اس کے علاوہ دوسری مساجد میں بھی ایسا ہی ہوا، دوپہر کے وقت نادر شاہ بذاتِ خود محمد شاہ کی جائے سکونت پر گیا اور وہاں پہونچ کر تاوانِ جنگ سے متعلق بات چیت شروع کی، کمرہ کے اندر کیا باتیں ہوئیں، اس کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا، ہم کو صرف ایران کے شاہی سکریٹری کے الفاظ سے کچھ کچھ اندازہ لگ جاتا ہے کہ آپس میں کیا بات چیت ہوئی۔ (جہان کشا ص ۳۵۵)

سکریٹری بیان کرتا ہے کہ:۔

"نادر شاہ نے بہت ہی خلوص و محبت کے ساتھ اور مشفقانہ طور سے کہا کہ ہندوستان کے تخت و تاج کا مالک محمد شاہ ہی رہے گا اور وہ ہمیشہ شہنشاہ کے ساتھ ہمدردی اور مدد کرتا رہے گا" اس لئے کہ دونوں بادشاہ ترکمان نسل سے تعلق رکھتے تھے یہ معاہدہ پہلے دن کی دوران گفتگو ہوا تھا، محمد شاہ نے شاہِ ایران کا شکریہ ادا کرنے کے لئے اپنے سر کو جھکا دیا اور اس کے سخاوتانہ طرزِ عمل کی بہت دیر تک تعریف و توصیف کرتا رہا محمد شاہ نے کوئی معمولی یا چھوٹی چیز نہیں پائی تھی۔ نادر شاہ سے تخت و تاج اور یہاں تک کہ اس کی زندگی کا گرانقدر تحفہ بھی اسکو مل گیا تھا۔ شکرانہ ادا کرنے کے لئے محمد شاہ نے نادر شاہ کے سامنے جمع کردہ بیش بہا ذخیرے کے منہ کھول دئیے اور وہ بیش بہا اشیاء جو اب تک کے بادشاہوں نے خون پسینہ ایک کر کے جمع کی تھیں، سب کی سب نادر شاہ کو تحفے کے طور پر دے دیں اور ایک ایک نایاب چیز اس پر نثار کر دی لیکن خوددار اور عظیم ایرانی بادشاہ نے تمام چیزیں لینے سے انکار کر دیا اس لئے کہ وہ تو اس زبردست خزانے کا طلبگار تھا، جسکا موازنہ ساری دنیا کے بادشاہوں کے خزانوں سے اگر کیا جائے تو یہاں کے خزانہ کا دسواں حصہ بھی نہیں نکلے گا۔ آخر کار محمد شاہ کے امراء بھیم پر وہ اپنے ارادے کو بدلنے کیلئے مجبور ہو گئے اور پھر اپنے معتمد افسران کو روپیہ اور دوسری اشیائے قیمتی کی فہرست بنانے کے لئے مقرر کر دیا"!!

ایرانیوں کے خلاف دھلی کے عوام کی شورش۔

محل میں امن و صلح کی بات چیت چل رہی تھی اور شہر میں اس کے برخلاف ہنگامے برپا تھے، نادر شاہ کی فوج زیادہ تر ترک، کرد اور منگولی نسل کے لوگوں پر مشتمل تھی، یہ لوگ دہلی کی سڑکوں اور بازاروں میں بڑی لاپرواہی اور مستانہ انداز میں ادھر ادھر سیر و گشت کرتے پھر رہے تھے، تقریباً ۴ بجے شام (بروز سنیچر ۱۱ر مارچ) کو یکبارگی کچھ فتنہ پرداز اور آوارہ گھومنے پھرنے والوں نے یہ افواہ پھیلانا شروع کر دی کہ محل کے محافظ دستوں میں سے ایک قلمقی عورت نے محمد شاہ کے اشارہ سے نادر شاہ کو بہت ہی بے رحمی سے قتل کر ڈالا ہے اور یہ قتل عید سے واپسی پر ہوا ہے ۔۔۔ آنند رام بیان کرتا ہے کہ ۔۔۔ نادر شاہ کے مفروضہ قتل کی افواہ دہلی کے عوام میں ایک آندھی کی طرح آناً فاناً پھیل گیا، عوام نے پہلے ہی سُن رکھا تھا کہ نادر شاہ شہنشاہ سے ملاقات کے لئے اس کے محل میں جانے والا ہے، تو اس طریقے سے اس مفروضہ افواہ نے یقین کی حد کو چھو لیا، کسی نے بھی محل جا کر اصلیت دریافت کرنے یا اس افواہ کی تصدیق کرنے کی کوشش نہیں کی، حالانکہ تمام دروازے کھلے ہوئے تھے اور لوگ اپنے اپنے کام سے آ جا رہے تھے یہ افواہ جنگل کی آگ کی طرح پھیل چکی تھی، اور فوراً ہی شہر کے نچلے طبقہ کے لوگوں اور دوسرے فتنہ پردازوں نے اپنے آپ کو ہتھیاروں سے لیس کر لیا اور ایرانی سپاہیوں پر حملہ کرنا شروع کر دیا اور ساتھ ہی ان لوگوں پر بھی جو سڑکوں پر اکیلے یا دو دو تین تین کے گروہوں میں ہاتھ میں ہاتھ ڈالے سیر میں مصروف تھے، قلیل تعداد، مقامی زبان سے لاعلمی، شہر کے راستوں اور گلیوں سے ناواقفیت کی وجہ سے وہ لوگ بالکل بے بس ہو کر رہ گئے اور ان کا قتل عام کر دیا گیا!

(باقی آئندہ)

مجلسِ تحقیقات و نشریاتِ اسلام

ندوۃ العلماء — لکھنؤ

ذرائع تعاون

● — سب سے بڑا تعاون مجلس کی مطبوعات و لٹریچر کو صحیح جگہوں پر پہنچانا اور ان کی اشاعت

● — مجلس کے کاموں کیلئے مستقل عطیے، مثلاً:

(الف) رکنیت دوامی (لائف ممبری) جو صاحب پانچسو روپے عنایت فرمائیں گے وہ مجلس کے لائف ممبر شمار ہونگے، لائف ممبر کو مجلس کی مطبوعات ہمیشہ بلاقیمت فراہم کی جائیں گی۔

(ب) ہمدرد، جو حضرات دو سو روپے عنایت فرمائیں گے وہ مجلس کے ہمدرد شمار ہونگے۔ مجلس ہمدرد کو پانچسال تک اپنی مطبوعات بلاقیمت پیش کریگی۔

(ج) معاون، جو حضرات پچیس روپے عنایت فرمائینگے وہ مجلس کے معاون شمار ہونگے۔ مجلس انھیں اپنی اولین کتاب "مقالات سیرت" بلاقیمت اور بقیہ تمام مطبوعات رعایتی قیمت سے فراہم کرے گی۔

اس کے علاوہ غیر مستقل عطیے اور مفید مشورے اس اہم کام کی ترقی و تقویت اور کارکنان مجلس کی ہمت افزائی کا باعث ہوں گے۔

• آج ہی رکنیت کا فارم پُر کرکے اپنی علم دوستی •

• اور اسلام نوازی کا ثبوت دیجئے •————•

دوسری منزل

بیج بوئے تھے تم نے جو کل ساقیو
آج دیکھو ذرا اس کی گل کاریاں

موت سے باندھ کر شرط سوتے تھے جو
حیرت انگیز ہے ان کی بیداریاں

ایک کروٹ ہی بدلی ہے غم نے ابھی
ساقیٔ بزم لرزہ بر اندام ہے

وقت سہما سا تاریکیاں مضمحل
چاند تاروں کی پھر روشنی عام ہے

غنچہ غنچہ چمن کا چٹکنے لگا،
تازگی پھول پتوں پہ آنے لگی،

زخم رستے ہوئے بند ہونے لگے
زندگی خود بخود مسکرانے لگی،

عزم و ہمت کے سیلاب کے سامنے
راہ کے خار و خاشاک بہنے لگے،

ریگ کے قصر و ایواں بنے تھے جو کل
سامنے عزم و ہمت کے ڈھنے لگے،

لیکن احساس یہ بھی رہے ساقیو!
منزلِ آرزو سے ابھی دور ہو،

راہ میں اب بھی تاریکیاں ہیں بہت
لطف جب ہے یہ ظلمت بھی کافور ہو

اور کچھ تیز گر اٹھاؤ قدم ساقیو
گیسوئے بزم امکاں سنور جائے گا

راہ میں ہار دی تم نے ہمت اگر
دیدہ و دل کی عظمت پہ حرف آئیگا

صبوحی صاحب
بستوی

غزل

مظہر جمیل

تمہارے غم نے ہمیں اشکبار بھی نہ کیا
یہ کیا ستم ہے کبھی بیقرار بھی نہ کیا

ہمیں نہ دیجئے الزام بے وفائی کا
یہ شیوہ ہم نے کبھی اختیار بھی نہ کیا

قریب پھر بھی رہا ہے تو زندگی سے مری
غم زمانہ تجھے میں نے پیار بھی نہ کیا

چمن میں پھول کھلے ہیں خزاں نہ آجائے
اس احتمال سے ذکر بہار بھی نہ کیا

تمہارے ساتھ جو ہوتا شریک غم ہوتا
اے دوست تم نے مرا انتظار بھی نہ کیا

بہت خلوص ہے اس دل میں دوستوں کیلئے
مگر کسی نے کبھی اعتبار بھی نہ کیا

غم زمانہ کو ہمراہ چل دیئے لے کر
اے لطف یاد ترا انتظار بھی نہ کیا

جمیل کھاتے رہے دل پہ زخم ہم چپ چاپ
مگر کبھی گلۂ جور یار بھی نہ کیا